حیاتِ سجادؒ

بانی امارت شرعیہ مفکر اسلام

مولانا ابوالمحاسن **محمد سجادؒ** رحمۃ اللہ علیہ

کی

حیات خدمات و منتخب تقریریں

مُرتّب

مولانا انیس الرحمٰن قاسمی

شعبۂ نشر و اشاعت

امارتِ شرعیہ بہار و اڑیسہ پھلواری شریف پٹنہ

حیاتِ سجّادؒ

مفکر اسلام

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجّاد رحمۃ اللہ علیہ

کی

سوانح حیات، علمی و فقہی، ملّی و سماجی اور سیاسی خدمات

پر مشتمل مقالات کا مجموعہ

مُرتّب

مولانا انیس الرحمٰن قاسمی

شائع کردہ

شعبۂ نشر و اشاعت امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ

پھلواری شریف، پٹنہ

نام کتاب ———— حیاتِ سجادؒ

مرتب ———— مولانا انیس الرحمٰن قاسمی

ناشر ———— شعبۂ نشر واشاعت امارت شرعیہ بہار واڑیسہ
پھلواری شریف، پٹنہ

تعداد اشاعت ———— ایک ہزار (۱۰۰۰)

سال اشاعت ———— ۱۴۱۹ھ ۱۹۹۸ء

کتابت ———— ابوبکر قاسمی، پٹنہ

قیمت ————

تقسیم کار ———— مکتبہ امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ

مطبع: بھارت آفسیٹ، دہلی-6، فون: 3284486۔

ملنے کے پتے

قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس، بی-۳۵ بیسمنٹ۔ نظام الدین ویسٹ،
نئی دہلی ۱۳۰

فہرست مضامین

پیش لفظ

مفکر اسلام حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجاد علیہ الرحمۃ ایک عہد ساز شخصیت کے مالک تھے۔ تواضع اور اخلاص کے ساتھ، جرأت و بیباکی، حق شناسی و حق گوئی ان کی خاص صفت تھی۔ ان کی ذات نرم دم گفتگو اور گرم دم جستجو کا نمونہ تھی۔ اپنے گہرے وعمیق علم، وسعتِ مطالعہ، اصابت رائے اور معاملہ فہمی میں وہ اپنے زمانہ کے علماء و مشائخ اور قومی و ملی قیادت کرنے والی ہستیوں میں نمایاں تھے۔ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے علم اور مسائل حاضرہ میں ان سے استنباط میں ان کو مہارت حاصل تھی، ان کی فقہی بصیرت ایسی تھی کہ علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ جیسا صاحب علم انھیں "فقیہ النفس" عالم کہا کرتے تھے۔ حضرت مولانا محمد سجاد رح ملت کے لیے دردمندی، ان کے مسائل و مشکلات کا حل اور مستقبل کا صحیح تجزیہ کر کے عملی طریقہ کار طے کرنے اور رُو بہ عمل لانے میں یکتا تھے۔ امت کی شیرازہ بندی اور دین اسلام کی بالادستی ان کی زندگی کا مشن تھا۔ ہندوستان میں امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ کے قیام کے علاوہ دیگر متعدد تنظیموں و جماعتوں، جمعیۃ علماء ہند اور خلافت کمیٹی وغیرہ ایسی ہیں جن کی بنیاد و ارتقاء میں مولانا کا بڑا حصہ رہا ہے۔ مولانا کی زندگی ہمہ جہت اور بڑی گوناگوں صفات کی حامل تھی، دین و ملت کے لیے افراد سازی و رجال کار کی تیاری، ان کی خاص خوبی تھی۔ ان کی ابتدائی

۲۵ سالہ تعلیمی زندگی کے علاوہ بقیہ چالیس سالہ زندگی جہد مسلسل میں گذری ہے، اور اس میں ملّت کے علما، و دانشوروں کے لیے عبرت و نصیحت ہے۔

زیر نظر کتاب "حیاتِ سجادؒ" مولاناؒ کی زندگی کا مرقع ہے۔ یہ علما، و مشائخ کے کے مقالات کا مجموعہ ہے، جسے مولانا انیس الرحمٰن قاسمی صاحب (نائب قاضی شریعت امارت شرعیہ) نے نئے سرے سے مرتب کیا ہے۔ امید ہے کہ ہماری نئی نسل اس کتاب کے ذریعہ مولانا علیہ الرحمۃ کے کام اور پیغام سے واقف ہوگی، اور اپنے مستقبل کی تعمیر کے لیے چراغِ راہ بنائے گی۔

نظام الدین
ناظم امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ
پھلواری شریف پٹنہ
۴ر جمادی الثانی ۱۴۱۹ھ

ابتدائیہ

بیسویں صدی کے نصف اوّل میں ہندوستان کے علمی وفکری، دینی وملّی، سیاسی وسماجی افق پر مسلم علماء ومشائخ اور قائدین ودانشوروں کا ایک بڑا طبقہ نمودار ہوا تھا، جس نے علم وادب، دین ومذہب اور سیاست وسماج پر گہرا اثر ڈالا، مگر ان تمام شخصیتوں میں ایسی ہستی جس نے فکر وعمل اور مذہب وسیاست پر بہت دیرپا اور دوررس گہرا اثر ڈالا ہو اور جیسے جیسے زمانہ گذرتا جا رہا ہے اس کی رائے کی صلابت اور فکر کی گہرائی واصابت اور اجاگر ہوتی جارہی ہے اور علماء ودانشور اس کی رائے کو ماننے اور اس کے طریقۂ کار پر چلنے پر اپنے آپ کو مجبور پا رہے ہیں، وہ مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمۃ کی ذات گرامی ہے۔ ان کی وفات پر ساٹھ سال کا طویل عرصہ گذر گیا۔ مگر آج بھی ان کی فکر تازہ اور چھوڑا ہوا اُسوہ مشعلِ راہ ہے۔

مولانا محمد سجاد کون تھے، کیا تھے، عزیمت واستقلال، خودداری وغیرت دینی، مروّت وتلطف، تواضع وسادگی، ایثار نفس وخاکساری میں ان کا مقام کیا تھا؟ علم وادب، منطق وفلسفہ، بلاغت ومعانی، قرآن وحدیث اور فقہ وفتاویٰ میں ان کا پایہ کس قدر بلند تھا؟ ان کا طریقۂ درس کیا تھا؟ مدارس وجامعات کے نصاب وطریقۂ تدریس کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر کیا تھا؟ اسلام کے دستوری وفقہی قوانین،

عدالتی طریقۂ کار اور احکام اسلام و نفاذ شریعت کے لیے انھوں نے کیا کیا اور کون سا راستہ اپنایا؟ تبلیغ دین و کفر و شرک کے خاتمہ، ارتداد کے مقابلہ کے لیے انھوں نے کیا کیا؟ مسلمانوں کے سماجی و معاشرتی مسائل کا حل انھوں نے کیا تلاش کیا تھا؟ ہندوستان کی آزادی، ہندو مسلمانوں کے ایک ساتھ اس ملک میں رہنے، ایک قوم یا دو قوم کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر کیا تھا؟ نئے مسائل کے بارے میں وہ قرآن و سنت سے کس طرح استدلال کرتے تھے؟ امت اسلامیہ ہند کے اتحاد و جماعتی زندگی کے لیے انھوں نے کیا کیا؟ فرقہ پرستی کے سدِباب کے لیے ان کی خدمات اور حکمتِ عملی کیا ہے؟ بہار میں مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی بناکر اور اسمبلی کا الیکشن جیت کر انھوں نے جو وزارت بنوائی اس سے کیا ملا؟ امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ، جمعیۃ علماء ہند اور خلافت کمیٹی کے قیام و ارتقاء میں ان کا حصہ کتنا اور کیا ہے اور ان تینوں پلیٹ فارم سے انھوں نے اندرون و بیرون ہند اسلام و مسلمانوں کے لیے کیا خدمات انجام دیں؟ ان کا سیاسی مسلک و مشرب کیا تھا اور عالم اسلام کے واقعات کی بابت ان کا نقطۂ نظر کیا تھا، اور ان تمام سیاسی، دینی و فکری مسائل میں ان کی فکر کی بلندی کس قدر تھی اور اس سے ہماری نسل کیا فائدہ اٹھا سکتی ہے؟ ـــــــ یہ چند اہم سوالات ہیں، جن کے حل کے لیے میں نے مولانا محمد سجاد علیہ الرحمۃ کی حیات و خدمات پر ہندوستان کے چوٹی کے علماء، مشائخ اور دانشوروں کے مقالات کو اس مجموعہ کے لیے منتخب کیا ہے۔ مذکورہ عناوین پر کم و بیش کہیں اختصار اور کہیں تفصیل سے ان مقالات میں مواد آگیا ہے۔ اس سے مستقبل کے تاریخ نویس و تحقیق کرنے والوں کو روشنی ملے گی۔ یہ مقالات تقریباً ساٹھ سال پہلے شائع ہوئے تھے۔ مفکر ملت حضرت مولانا محمد سجاد کی وفات کے بعد پہلا مجموعہ مولانا مسعود عالم ندوی صاحبؒ

نے "محاسنِ سجاد" کے نام سے مرتب کیا تھا۔ اس سے چھ مقالے لیے گئے ہیں:

(۱)	مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ	مولانا محمد اصغر حسین رحؒ
(۲)	محاسنِ ابوالمحاسن رحؒ	علامہ سید سلیمان ندویؒ
(۳)	دو آنسو	حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحؒ
(۴)	یادِ سجادؒ	مولانا سید محمد مجتبیٰ رحؒ
(۵)	مولاناؒ اور مجالسِ قانون ساز	حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی رحؒ
(۶)	مولانا کی یادیں	مولانا مسعود عالم ندوی رحؒ

اس کے بعد دوسرا مجموعہ حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی رحمۃ اللہ علیہ نے "حیاتِ سجاد رحؒ" کے نام سے مرتب کیا تھا۔ دیگر مقالات اسی سے ماخوذ ہیں اور اسی مناسبت سے اس کا نام بھی "حیات سجاد رحؒ" تجویز کیا گیا ہے۔

مفکر ملت حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ نے جو علمی ورثہ چھوڑا ہے، اس میں ایک تصنیف (نامکمل) بنام "حکومتِ الٰہیہ"، فتاویٰ اور دارالقضاء کے فیصلے، مقالات، مکاتیب اور خطبات ہیں۔

الحمدللہ! ان میں سے "حکومتِ الٰہیہ" ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ اور مفکر ملت کے فتاویٰ کی ترتیب و تحقیق و تحشیہ، فقیہ العصر حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب دامت برکاتہم کے حصہ میں آئی۔ اور الحمدللہ اس وقت یہ "فتاویٰ امارت شرعیہ جلد اول" کے نام سے زیر طبع ہے۔ فتاویٰ کے علاوہ ۱۹۲۱ء سے اکتوبر ۱۹۴۰ء تک آپ نے بحیثیت نائب امیر شریعت، قاضی شریعت کے فیصلوں کے خلاف مرافعہ (اپیل) کی سماعت کی اور فیصلہ کیا۔ آپ کے اس طرح کے فیصلے بھی زیر ترتیب ہیں۔ اسی طرح آپ کے مقالات

ومضامین، خطبات اور مراسلات کو بھی تلاش کیا جارہا ہے تاکہ انھیں بھی مرتب کرکے شائع کردیا جائے۔

اس مجموعہ "حیات سجاد" سے گرچہ مفکر ملت کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی پڑتی ہے، مگر پھر بھی ان کی ایک تفصیلی سوانح حیات کی ضرورت بہرحال باقی رہتی ہے، امید یہ ہے کہ اس سے ان کی زندگی کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

آخر میں اپنے احباب خاص طور پر جناب مولانا رضوان احمد ندوی صاحب کا شکرگذار ہوں جنھوں نے ان مضامین کی فوٹو کاپی کرانے اور کتابت کے لیے دینے اور اصلاح کے کام میں تعاون کیا۔ اللہ انھیں اور دیگر معاونین کو جزائے خیر دے۔

انیس الرحمٰن قاسمی
نائب قاضی شریعت امارت شرعیہ
۶/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۹ھ

مختصر سوانح حیات

از: مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی (ایم۔ایل۔اے) مونگیر

صوبہ بہار کا پٹنہ ہندوستان کے قدیم ترین شہروں میں سے ہے۔ اور ہندوستان کے ہر تاریخی دور میں پٹنہ کو مرکزیت حاصل رہی ہے۔ ہندو راجاؤں کے زمانہ میں بھی پٹنہ علم و سیاست کا مرکز تھا اور مسلمان بادشاہوں کے دور میں بھی اس نے اپنی خصوصیت کو باقی رکھا۔ جس زمانہ میں علوم مشرقیہ کا عروج تھا، ہر فن کے بہتر سے بہتر اساتذہ اور اچھے سے اچھے ماہر یہاں پیدا ہوئے اور عرصہ گذر جانے کے بعد بھی ان کی تصنیفات کو آج وہی قبولیت اور اہمیت حاصل ہے جو اس وقت تھی۔

اسی ضلع میں ایک قصبہ بہار شریف ہے، جس کے نام پر یہ صوبہ "صوبہ بہار" کہلاتا ہے جس کو ہندوستان کے مشہور بزرگ حضرت شیخ شرف الدین رحمۃ اللہ علیہ کے مسکن ہونے کی عزت بھی حاصل ہے، جنھیں عام طریقہ سے لوگ حضرت مخدوم بہاری کہا کرتے ہیں۔

اس قصبہ سے کچھ فاصلہ پر "راجگیر" ایک فرحت افزا اور صحت بخش مقام ہے، جہاں حضرت مخدوم بہاری ریاضت اور چلہ کشی وغیرہ کیا کرتے تھے۔

بہار شریف سے راج گیر سڑک جاتی ہے۔ اسی سڑک پر چھ میل کے بعد پنہسہ ایک گاؤں ہے۔ شہروں کی چہل پہل سے دور اور بازاروں کی رونق سے محروم، چھوٹی سی آبادی کا ایک

ٹھیٹھ دیہات ہے، جہاں نہ شہری تہذیب و تمدن سے واسطہ ہے اور نہ بازاری بناؤ سنگار سے کوئی تعلق. گاؤں پر سرسری نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ یہاں لوگ غریب مگر دیندار اور قانع، لوگوں کا پیشہ کاشت کاری ہے اور ہر شخص اسی میں مشغول ہے لیکن اسی گاؤں کے شمال میں ایک اونچی دہلیز کا مکان ہے جو پورے گاؤں میں ممتاز معلوم ہوتا ہے۔

صاحب خانہ مولوی سید حسین بخش صاحب ہیں، آدمی دیندار اور متقی اور مولوی سے زیادہ صوفی مشرب ہیں۔ مولوی حسین بخش صاحب نے عربی کی تعلیم حاصل کی تھی لیکن تمام کتابیں پوری نہ ہو سکی تھیں۔ موصوف نے سن شعور کو پہونچنے کے بعد کچھ دنوں تک تو پڑھانے کا سلسلہ رکھا لیکن اس مشغلہ میں دل نہ لگا۔ پڑھانا چھوڑ کر گھر آ گئے۔ کاشت کاری اور ٹھیکہ داری میں مشغول ہو گئے جو آبائی ذریعہ معاش تھا۔ اور پھر پوری زندگی اسی میں صرف کر دی۔

صوفی مشرب تو تھے ہی اس پر اخلاق بھی وسیع تھا۔ اس لیے کبھی گھر مہمانوں سے خالی نہ رہتا۔ راہگیر جانے والے اور پھر وہاں سے واپس آنے والے کم از کم ایک وقت ضرور مہمان ہوتے اس طرح اس گھر کی شہرت دور دور تک پہونچ گئی تھی۔

ماہ صفر ۱۳۰۱ھ (مطابق.......) میں مولوی حسین بخش صاحب کے گھر میں لڑکا پیدا ہوا۔ گھر میں خوشی منائی گئی۔ گاؤں والوں نے آکر مبارکباد دی۔ باپ نے بیٹے کا نام "محمد سجاد" رکھا کنیت "ابوالمحاسن" ہوئی یہ معلوم نہیں کہ کنیت کس نے رکھی، لیکن یہ کنیت گویا الہامی تھی جو محمد سجاد کے مستقبل پر پوری طرح صادق آئی اور بالکل صحیح اتری جس کی تصدیق اس "مجموعہ" سے بآسانی ہو سکتی ہے۔

مولانا سجاد کے بچپن کا زمانہ تھا۔ ابھی عمر صرف چار سال ہوئی تھی کہ ۱۳۰۴ھ میں مولوی حسین بخش صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اور اس طرح شفیق باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اب مولانا کے

سرپرست اپنے بڑے بھائی مولوی احمد سجاد صاحب تھے، جو ماشاءاللہ اب تک بقید حیات ہیں اور اپنے زہد و تقویٰ کے باعث "صوفی صاحب" کہلاتے ہیں۔

مولانا رح نے جب زندگی کے چھٹے سال میں قدم رکھا تو مولانا رح اپنے ہی مکان پر گھر کے مولوی صاحب کے پاس پڑھنے کے لیے بٹھلائے گئے اور وہیں اردو فارسی اور قرآن مجید کی تعلیم حاصل کی۔

عربی کی ابتدائی تعلیم کے لیے ۱۳۱۱ھ میں مدرسہ اسلامیہ بہار شریف میں داخل کیے گئے۔ اس وقت مدرسہ کے ناظم مولانا حافظ سید وحید الحق صاحب استھانوی تھے۔ ــــــ مدرسہ میں داخلہ یوں ہوا کہ ایک تو بہار شریف پنہسہ سے صرف چھ میل پر تھا، اور دوسری بات یہ بھی تھی کہ ناظم صاحب مولانا رح کے رشتہ دار تھے۔ ناظم صاحب کی شادی مولانا کی چچیری بہن سے ہوئی تھی اور گھر کے فرائض بھی وہ بہت اچھی طرح انجام دے سکتے تھے۔

مولانا بچپن میں پڑھنے سے بھاگتے تھے اور زیادہ وقت کھیل کود میں صرف ہوا کرتا تھا مدرسہ اسلامیہ میں بھی یہی حال رہا۔ کچھ دنوں کے بعد بڑے بھائی مولوی احمد سجاد صاحب کے ساتھ کانپور تشریف لے گئے اور مولانا احمد حسن صاحب کانپوری کے حلقۂ درس میں داخل ہو گئے۔ جناب مولوی احمد سجاد صاحب کانپور میں علیل ہو گئے، اس لیے دونوں بھائی مکان واپس آئے ــــــ یہ مولانا کی عمر کا پندرہواں سال تھا۔ لیکن تعلیم کے سلسلہ میں اب تک وہی حال تھا، پڑھنے سے بھاگتے تھے۔ ایک روز بڑے بھائی نے سخت تنبیہ کی اور زدوکوب کیا۔ مولانا اسی روز گھر سے غائب ہو گئے۔ کچھ دنوں تک تو پتہ ہی نہ چلا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ کانپور میں ہیں اور پڑھتے ہیں۔ اس طرح گویا یہاں سے مولانا کی تعلیم شروع ہوتی ہے۔ تین برس کے بعد مکان تشریف لائے تو اس وقت شرح وقایہ وغیرہ پڑھ رہے تھے۔

جب مولانا میں پڑھنے کا شوق پیدا ہوا تو کانپور ہی سے دیوبند کا قصد کیا۔ دیوبند آئے اور پڑھنے لگے۔ تقریباً چھ ماہ تک دیوبند میں قیام رہا ہوگا کہ تبت کے ایک لڑکے سے لڑائی ہوگئی اور مولانا کو مجبوراً دیوبند چھوڑنا پڑا۔

سنہ ۱۳۱۷ھ میں مولانا کانپور سے الٰہ آباد چلے آئے اور مدرسہ سبحانیہ میں داخل ہوئے۔ مشکوٰۃ المصابیح، تفسیر جلالین، ملا حسن مولا عبدالکافی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھنے لگے۔ مدرسہ سبحانیہ میں مولانا کا قیام سنہ ۱۳۲۲ھ تک رہا۔ اور اس دوران میں عربی کے مروجہ نصاب کو مولانا نے پورا کر لیا۔

۱۷، ۱۸، ۱۹ ربیع الاول سنہ ۱۳۲۲ھ مطابق ۳، ۴، ۵ جون سنہ ۱۹۰۵ء کو مدرسہ سبحانیہ میں جلسۂ دستار بندی شان و شوکت سے ہوا۔ اسی میں مولانا کی رسم دستار بندی ادا کی گئی۔ ذہانت و ذکاوت اور قوت حافظہ اور بے مثل اخلاق و عادات کی وجہ سے الٰہ آباد میں مولانا کا زمانۂ طالب علمی بہت شاندار اور کامیاب رہا۔ مولانا ہمیشہ اساتذہ کی نظر میں اور طلبہ کی نگاہ میں محترم رہے۔

مدرسہ سبحانیہ سے فراغت کے بعد مولانا سید وحید الحق صاحب کی طلبی پر مولانا مدرسہ اسلامیہ بہار شریف چلے گئے اور وہاں مدرس ہوگئے۔ یہاں مولانا کا قیام تین سال رہا۔ اپنے استاذ محترم مولانا عبدالکافی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طلبی پر الٰہ آباد تشریف لے گئے۔ یکم محرم سنہ ۱۳۲۵ھ کو مدرسہ سبحانیہ میں مولانا کا تقرر مدرس کی حیثیت سے ہوگیا۔ لیکن چار ماہ کے بعد مولانا پھر مدرسہ اسلامیہ بہار شریف چلے آئے۔ اس دفعہ مولانا رح کا قیام بہار شریف میں ڈیڑھ سال رہا کہ استاذ محترم کی شفقت نے پھر اپنی طرف کھینچا۔ اور ذی قعدہ سنہ ۱۳۲۶ھ میں مولانا پھر مدرسہ سبحانیہ میں بحیثیت مدرس کے تشریف لے آئے اور سنہ ۱۳۲۹ھ تک یہاں

پڑھانے کے فرائض انجام دیتے رہے۔

شعبان ۱۳۲۹ھ میں مولانا نے الٰہ آباد کو چھوڑا اور اب قیام کے ارادہ سے صوبہ بہار تشریف لے آئے اور گیا پہونچ کر مدرسہ انوار العلوم کو دوبارہ قائم کیا[1]۔ مولانا صوبہ بہار کیوں تشریف لائے اور انوار العلوم کیوں قائم کیا، اس کی وجہ آگے آئے گی۔ بہرحال تھوڑے ہی عرصہ میں انوار العلوم علوم عربیہ کا مرکز ہوگیا۔ گرچہ مولانا کو اس سلسلہ میں بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے پہلی ضرورت غریب طلبہ کے کھانے کی ہوتی ہے۔ سرمایہ زیادہ تو تھا نہیں کہ بہتر نظم کر سکتے، اس لیے تھوڑے ہی روپیہ میں زیادہ طلباء کو کھلاتا تھا۔ بعض دفعہ کئی کئی روز تک طلباء اور مولانا بھی صرف چنے کھا کر گذارا کرتے، لیکن تکلیف نے کبھی بھی ارادہ میں ضعف اور قدموں میں لغزش نہیں پیدا کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا کی کوششیں کامیاب ہوئیں۔ مدرسہ کے لیے ایک شاندار عمارت بن گئی، طلبہ کو ہر قسم کی آسانیاں میسر آئیں اور آج بھی یہ مدرسہ مولانا رح کی یاد تازہ کر رہا ہے۔

فراغت کے بعد مولانا نے تقریباً سترہ اٹھارہ سال تک درس دیا۔ مولانا کا زمانۂ تدریس بہت شاندار اور کامیاب رہا۔ جس مدرسہ میں پڑھانے پہونچے وہاں کی حالت ہی بدل دی، مولانا کا پہونچ جانا مدرسہ کی کامیابی کی ضمانت تھی۔ فراغت کے بعد سب سے پہلے مولانا مدرسہ اسلامیہ بہار تشریف آئے۔ اس وقت مولانا رح کی عمر صرف ۲۳ سال کی تھی لیکن آتے ہی مدرسہ کا رنگ بدل گیا۔ طلبہ کا شوق، مدرسین کی جدوجہد اور مقامی حضرات کی توجہ اور دلچسپی ہر چیز میں اضافہ ہوگیا۔ یوں تو مدرسہ ایک عرصہ سے قائم تھا، مگر نہ کبھی طلبہ کی تعداد زیادہ رہی اور نہ کبھی جلالین

---

[1] مدرسہ انوار العلوم مولانا عبدالوہاب صاحب فاضل بہاری مرحوم نے قائم کیا تھا۔ لیکن مولانا موصوف کی علاحدگی کی وجہ سے مدرسہ ختم ہوگیا تھا۔

شرح وقایہ اور میبذی قطبی سے اونچے پڑھنے والے مدرسہ میں آئے، لیکن ایک ہی سال میں مولانا کے درس کا ایسا شہرہ ہوا کہ طلبہ جوق در جوق آنے لگے اور دوسرے ہی سال عربی کے نصاب کی آخری کتابیں ہونے لگیں۔ چنانچہ مولانا اصغر حسین صاحب نے ترمذی شریف وغیرہ مدرسہ اسلامیہ میں مولانا ہی سے پڑھی۔ پھر جب مولانا رح بہار شریف سے مدرسہ سبحانیہ الہ آباد تشریف لے گئے تو چند ہی دنوں بعد آپ کے درس کا ایسا چرچا ہوا کہ طلبہ کانپور چھوڑ کر الہ آباد آنے لگے۔ باوجودے کہ کانپور میں اچھے اچھے فضلاء موجود تھے۔ چنانچہ مولانا کے شاگرد رشید مولوی عبدالحکیم صاحب مرحوم (مہتمم مدرسہ انوارالعلوم) کانپور میں پڑھتے تھے، محض مولانا کے درس کی شہرت سن کر کانپور سے الہ آباد آگئے اور پھر ساری کتابیں مولانا ہی سے پڑھیں۔

مولانا رح کا سلوک طلبہ کے ساتھ اس درجہ بہتر تھا کہ ان دنوں اس کا تصور مشکل ہے کھانے پینے، رہنے سہنے، اور پڑھنے میں مولانا نے کبھی امتیاز روا نہ رکھا۔ یہ ناممکن تھا کہ مولانا کھائیں، اور طالب علم بھوکا رہ جائے۔ بیمار طلبہ کے علاج کا نظم خود مولانا کیا کرتے تھے۔ حکیم کے یہاں لیجانا دوا لانا، دوا پلانا، تیمارداری کرنا۔ ان میں سے زیادہ کام مولانا خود اپنے ہاتھوں سے انجام دیا کرتے تھے، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ طلبہ مولانا پر اپنی جان قربان کرنے کو تیار رہتے تھے۔ آج بھی مولانا کے جو شاگرد موجود ہیں وہ اس وقت بھی مولانا کی شفقت اور مہربانیوں کو ہمیشہ یاد کرتے ہیں، اور انھیں اس کا اعتراف ہے کہ جتنی خدمت مولانا نے ہماری کی ہوگی، اتنی خدمت ہم مولانا کی نہیں کر سکے ہیں۔

بہرحال یہ سترہ برس کا زمانہ تدریس بھی مولانا کی زندگی میں بہت کامیاب اور شاندار زمانہ ہے۔ ہندوستان میں کے بڑے فضلاء اور کامیاب ترین درس دینے والے گذرے ہیں اور آج بھی کچھ موجود ہیں۔ مگر کم لوگوں کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس قدر جلد علمی صفوں میں نمایاں ہوئے ہیں۔ جس قدر جلد اور جتنی کم سنی میں مولانا کے علم و تبحر کو اہل علم نے تسلیم کر لیا، اگر مولانا نے اپنی زندگی کا رخ دوسری طرف

نہ پھیر دیا ہوتا اور وہ برابر پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہتے تو بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہندوستان کے سب سے زیادہ کامیاب مدرس اور سب سے زیادہ شفیق استاد ہوتے۔

میں نے اوپر لکھا ہے کہ ۱۳۲۹ھ میں مولانا نے الٰہ آباد کو خیرباد کہا اور گیا کے مدرسہ انوارالعلوم میں روح پھونکی، دراصل یہیں سے مولانا کی زندگی پلٹا کھاتی ہے اور دھارے کا رُخ دوسری طرف پھرتا ہے۔

واقعہ اس طرح ہے کہ جب مولانا الٰہ آباد میں پڑھایا کرتے تھے تو ایک شخص زاہد خاں دریا آباد[1] سے مولانا سے پڑھنے آیا کرتے تھے۔ زاہد صاحب انگریزی پڑھے ہوئے تھے۔ انگریزی اخبارات برابر لاکر مولانا کو سنایا کرتے تھے، جس میں ممالک اسلامیہ کے بارے میں بہت ہی تشویشناک خبریں ہوا کرتی تھیں، جن سے مولانا کے دل و دماغ بہت زیادہ متاثر ہوا کرتے تھے۔ اسی تاثر نے مولانا کے غور و فکر کے موضوع کو بدلا، وہ دماغ جو اب تک برابر مختلف علوم و فنون کی باریکیوں پر صرف ہوا کرتا تھا اور وہ فکر جو اب تک مشکل سے مشکل علمی مسائل کی گتھیاں سلجھانے میں کام آیا کرتی تھی، وہ مسلمانوں اور ہندوستان کے دوسرے اہم مسائل تک بھی پہنچنے لگی اور درس و تدریس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے دوسرے مسائل پر غور و فکر میں بھی وقت صرف ہونے لگا۔ ایک مصلح قوم کی تمام خوبیاں پہلے سے موجود تھیں، خداداد صلاحیت، ذکاوت و تدبر اور فکر رسا کی کمی نہ تھی۔ ان سب چیزوں میں قدرت نے کم از کم مولانا کے ساتھ بخل نہیں کیا تھا، بلکہ وافر عطا کی تھی۔ ایسے دل و دماغ کے لیے مدرسہ کی چہار دیواری کافی نہیں ہو سکتی تھی اور نہ ہی ایک ہی کتاب کا ہر سال پڑھتے پڑھاتے رہنا دلچسپی کا باعث ہو سکتا ہے۔ اُسے

---

[1] دریاباد، الٰہ آباد میں ایک محلہ کا نام ہے۔

وسعت کی ضرورت تھی جب کہ دوسرے مسائل سامنے آگئے تو وسعت مل گئی۔ پہلے مولانا کے سامنے صرف مدرسہ مدرسین، طلبا یا اس کے ہمدرد و لواحقین تھے۔ اب ان کی نگاہ کے سامنے دنیا میں بسنے والا ہر ایک مسلمان اور ہندوستان میں رہنے والا ہر ایک انسان تھا۔ پہلے ان کے دماغ کی خوراک مروجہ علمی گھر تھے۔ اب دنیائے اسلام میں عموماً اور ہندوستان میں خصوصاً روزانہ پیدا ہونے والے نئے نئے معاملات تھے۔ بس اب کیا تھا، مولانا نے وہ چیز پالی جس کی انھیں ضرورت تھی، ضرورت ہی نہیں جس کے لیے وہ پیدا کیے گئے تھے۔ چند ہی روز کے غور و فکر کے بعد دماغ نے فیصلہ کیا اور صحیح فیصلہ کیا کہ درس و تدریس سے بھی زیادہ اہم ملک اور دین کے دوسرے کام ہیں۔ ان ہی حالات میں گیا آئے اور مدرسہ کھولا۔ مدرسہ کھولنے کے دو مقصد تھے۔ ایک تو یہ کہ اپنی زندگی کے اس دور کی یادگار ہمیشہ کے لیے باقی رہ جائے، اور صحیح معنوں میں تعلیمی سلسلہ جاری رہے۔ دوسرے یہ کہ لوگوں میں تعارف ہو جائے۔ اور لوگوں کو اس کا موقع ملے کہ مولانا کو جانچیں اور پرکھیں اور مولانا قومی اور سیاسی مسائل کے لیے فضا کو ہموار اور راستہ کو صاف کرسکیں۔ چنانچہ مولانا نے گیا پہونچ کر قومی اور ملکی کاموں میں حصہ لینا شروع کردیا۔ علماء کی تنظیم جمعیتہ علماء کا قیام۔ تمام مدارس عربی میں ایک اصلاحی نصاب کا اجراء امارت شرعیہ کی اسکیم وغیرہ۔ یہ سب چیزیں مولانا کے دماغ نے گیا ہی میں پیدا کیں اور اسی زمانہ میں مولانا رح نے اپنی اسکیموں کو عملی شکل بھی دینا شروع کردی۔ چنانچہ ۱۹۱۷ء میں مولانا نے "انجمن علماء" قائم کی جس کے ڈو برس بعد ۱۹۱۹ء میں جمعیتہ علماء ہند دہلی کا قیام عمل میں آیا بہر حال گیا آنے کے بعد مولانا رفتہ رفتہ تعلیمی مشغلہ سے کنارہ کش ہوتے گئے اور قومی میدان میں مولانا کا قدم بڑھتا گیا۔ پھر ایک زمانہ وہ آیا کہ مولانا کی زندگی کا ہر لمحہ قومی و ملکی کاموں کے لیے صحیح معنی میں وقف ہو گیا۔ سیاسی زندگی میں آنے کے بعد مولانا خود اپنے سے، بیوی بچوں سے، گھر اور جائداد سے

بالکل بے پرواہو گئے، جیسے کوئی چیز ان کی نہ ہو۔ بچوں کی بیماری، بیوی کی علالت، رشتہ داروں کی مصیبت، خود اپنی تکلیف، حد یہ کہ جگر پاروں کی موت غرض یہ اور اس قسم کی تمام چیزوں پر قومی کام مقدم تھا۔

مولانا کا بڑا لڑکا "حسن سجاد" میرا ہم عمر ہیں نے اور حسن نے حدیث کی کتابیں ساتھ پڑھیں دیوبند سے بیمار ہو کر مکان پہونچا۔ یہ واقعہ زلزلہ کے بعد کا ہے۔ مولانا زلزلہ زدہ علاقوں کا دورہ فرما رہے ہیں۔ حضرت مولانا احمد سعید بھی ساتھ ہیں۔ تار ملتا ہے کہ حسن بیمار ہے مولانا نے خط کے ذریعہ جواب دے دیا پھر تار آتا ہے کہ حالت خراب ہے۔ مولانا بذریعہ تار ہدایت فرماتے ہیں کہ پٹنہ کے شفا خانہ میں داخل کر کے علاج کراؤ۔ پھر تار آتا ہے کہ زندگی کی کوئی امید نہیں۔ غور فرمائیے۔ جوان بیٹا ہے، ابھی ابھی تعلیم سے فارغ ہوا ہے اور موت وحیات کی کش مکش میں مبتلا ہے، لیکن اسی اصول پر کہ سب کاموں پر قومی کام مقدم ہے۔ مولانا سفر فرما رہے ہیں۔ جب مولانا احمد سعید صاحب وغیرہ مجبور کر کے گھر کا سفر کرتے ہیں تو آتے ہیں مگر ایسے وقت پر کہ مولانا بیمار بیٹے پر صرف حسرت کی نظر ڈال سکے اور بیٹا تو یہ بھی نہ کر سکا۔ اسی پر بس نہیں، شام کو تجہیز وتکفین سے فارغ ہوئے اور صبح ہی سفر پر روانہ ہو گئے یا شاید ایک دو دن کے بعد۔

مولانا کے سیاسی کیرکٹر میں بہت ہی اہم اور نمایاں پہلو خلوص وللّٰہیت کا ہے۔ مولانا نے بڑے سے بڑا اقتدار ہاتھ میں آنے کے بعد کبھی کبھی اپنی یا اپنے قرابت مندوں کی نفع رسانی کی طرف توجہ نہیں کی۔ ذرا غور کیجیے کہ مولانا سجاد کا صوبہ بہار کے چالیس لاکھ مسلمانوں پر پورا اقتدار ہے بیسیوں کو اسمبلی اور کونسل کا ممبر بنواتے ہیں۔ ممبروں کو وزارت اور وزارت عظمیٰ کے عہدوں پر فائز کرتے ہیں۔ صوبہ بہار کی حکومت مولانا اور صرف مولانا کی ہے۔ وزرا کو مولانا کا حکم خوشی سے یا ناخوشی سے بجا لانا ضرور پڑتا ہے۔ یہ سب کچھ ہے لیکن وہی مولانا اپنے پریشان حال داماد

مولوی علی حسن صاحب رونق کو پانچ روپئے کی نوکری نہیں دلوا سکتے۔ آپ نے دیکھا، دوسروں کے معاملہ میں اتنا با اختیار اور اپنے معاملہ میں اتنا بے بس! یہ تھا مولانا کا سیاسی کیرکٹر جس کو انھوں نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ ایک دو نہیں، چھوٹے بڑے ملا کر سیکڑوں قائد و رہنما ہندوستان میں موجود ہیں۔ لیکن انھیں ذرا اس کسوٹی پر تو پرکھ کر دیکھیے۔

یوں تو مولانا رح میں سیاسی خیالات کی نشو و نما ۹-۱۹۰۸ء ہی سے ہو رہی تھی لیکن سے وہ زمانہ شروع ہو گیا۔ جہاں سے مورخ مولانا کی سیاسی خدمات کا باب شروع کر سکتا ہے۔ ابتداءً دو چار برس مولانا نے سیاسی زندگی کے ساتھ تعلیمی مشغلہ کو جاری رکھا، لیکن پھر مولانا تمام چیزوں سے علاحدہ اور کنارہ کش ہو گئے، اور پوری طرح اپنی اسکیموں کو کامیاب بنانے میں اپنا وقت صرف کرنے لگے۔ اس طرح کم و بیش چوبیس برس مولانا نے قومی سیاسی زندگی گذاری۔ اس میں مولانا نے تمام نشیب و فراز دیکھے، سخت سے سخت مصیبتیں جھیلیں، لوگوں کی زبان سے گالیاں بھی سنیں اور پھر ان ہی کے ہاتھوں سے پھولوں کے ہار بھی پہنے۔ ایسا بھی ہوا کہ گاؤں والوں نے تقریر نہیں کرنے دی اور گویا نکال دیا۔ اور یہ بھی دیکھا کہ مولانا کی سواری کے ساتھ کوس دو کوس تک گاؤں والے خوشی میں نعرہ لگاتے دوڑتے چلے جا رہے ہیں۔

مولانا کی سیاسی زندگی پر جو بھی قلم اٹھائے گا، وہ یہ لکھنے پر مجبور ہے کہ مولانا نے کامیاب اور شاندار سیاسی زندگی گذاری۔ ایک طرف مولانا نے امارت شرعیہ قائم کر کے اس اہم ترین مسئلہ کو حل کیا کہ مسلمانوں کو ہندوستان میں کس طرح زندگی گذارنی چاہیے دوسری طرف مولانا اسمبلی اور کونسل پر قبضہ کر کے وزارت قائم کی اور سیاسی اقتدار و قوت اپنے ہاتھ میں لی۔ اور یہ بتلایا کہ طاقت و قوت کا کیا مصرف ہے اور دنیا کس طرح چلائی جاتی ہے۔

بہرحال یہ چند باتیں تو جذبات کی رو میں قلم سے نکل گئیں۔ ورنہ "مولانا کی سیاسی زندگی" میری تحریر کا موضوع نہیں، جن کا یہ موضوع ہے اس پر لکھنے کے وہی حقدار ہیں۔ اور وہ اس حق کو مجھ سے بہتر انجام دے سکتے ہیں۔ لیکن اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مجھے بہت سے رہبروں، اور رہنماؤں سے شرف ملاقات حاصل ہے۔ لیکن وہ مولانا کی طرح مذہب کی لگن، قوم وملک کا جنون، کام کا سودا، اور پھر اس سلسلہ میں پوری طرح خود فراموشی میں نے کسی اور میں نہیں دیکھی۔

مولانا کی تین شادیاں ہوئیں۔ پہلی شادی انیس برس کی عمر میں (۱۳۲۰ھ) مولانا سید وحید الحق مرحوم ناظم مدرسہ اسلامیہ بہار شریف کی صاحبزادی سے ہوئی۔ یہ بیوی چودہ برس تک زندہ رہیں۔ ان سے پانچ اولادیں ہوئیں۔ دو لڑکے، تین لڑکیاں۔ جن میں سے اب صرف صاحبزادی موجود ہیں۔

پہلی بیوی کے انتقال کے دو برس بعد (۱۳۳۶ھ) گیلانی میں خان بہادر مولانا سید عبدالعزیز صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی۔ ان سے چھ اولادیں ہوئیں۔ تین لڑکے، تین لڑکیاں۔ اب صرف دو موجود ہیں۔

مولانا کی دوسری اہلیہ جن کا ابھی ذکر ہوا، وہ کچھ عرصہ کے بعد بہت زیادہ علیل رہنے لگیں اور آنکھوں سے بالکل مجبور ہوگئیں۔ گھر کا کام اور بچوں کو سنبھالنا بھی ان سے ناممکن ہوگیا اس وقت مولانا نے تیسری شادی گیا میں ایک بیوہ سے کی، ان سے بھی ایک اولاد ہوئی تھی۔

مولانا ایک خوش حال کاشت کار گھرانے کے فرزند تھے، زمینداری بھی تھی مگر مختصر مولانا کے والد مرحوم ٹھیکہ داری بھی کرتے تھے، جس سے انھوں نے اپنی جائداد کو ترقی دی تھی۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔ مولانا کے والد کا انتقال تو ۱۳۰۴ھ میں ہو چکا تھا۔ اس وقت

مولانا کے بڑے بھائی مولوی احمد سجاد صاحب بھی کچھ زیادہ بڑے نہ تھے۔ لیکن جائداد کا نظم وہی کرتے رہے۔ پھر جب مولانا فراغت کے بعد مدرسہ اسلامیہ میں مدرس ہوئے تو مکان صرف چھ میل کے فاصلہ پر تھا، خود دیکھ بھال کرتے رہتے۔ اس طرح دونوں بھائیوں کی توجہ سے کچھ عرصہ تک جائداد کا نظم اچھی طرح ہوتا رہا۔ گھر میں ہر طرح کی خوش حالی رہی۔ لیکن پھر صورت حال یہ ہوئی کہ ایک طرف مولوی احمد سجاد صاحب پر مجذوبانہ کیفیت طاری ہوئی، انھوں نے گھر چھوڑ کر راجگیر کی پہاڑیوں کی راہ لی، اور مولانا کی قومی و سیاسی مشغولیت روز بہ روز بڑھنے لگی۔ نوکروں پر جائداد کا مدار رہا اس لیے کاشت کاری وغیرہ کی حالت خراب ہوتی گئی۔ پھر مولانا کی مشغولیت نے یہ معلوم کرنے کی فرصت بھی نہ دی کہ کس زمین کا "مال" یا "مالگذاری" ادا ہوئی، کس کی باقی ہے اور کون سی نیلام ہو چکی، کون سی نیلام ہونے والی ہے۔ ایک دفعہ پٹنہ میں مولانا ایک وکیل صاحب کے یہاں جا رہے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ وہاں کیا کام ہے؟ فرمانے لگے کہ چوبیس بیگہ زمین مالگذاری ادا نہ کرنے کے باعث نیلام ہو گئی مجھے پہلے کوئی اطلاع نہ تھی، اس لیے وکیل صاحب کے پاس جا رہا ہوں کہ اب اس کے بچانے کی کوئی شکل ہو سکتی ہے یا نہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد مولانا واپس ہوئے تو میں نے دریافت کیا کہ کیا ہوا؟ فرمایا کہ نیلام ہوئے کچھ عرصہ ہو گیا۔ اب اس کی واپسی مشکل ہے۔ مجھے جواب دے کر دوسرے کاموں میں لگ گئے۔ میں حیران تھا کہ ذرا اس مرد مجاہد کے ایثار اور استغنا کو دیکھیے۔ کم از کم پانچ ہزار روپئے کی جائداد ہاتھ سے نکل گئی اور ذرا خیال بھی نہ آیا۔

آخر زمانہ میں مولانا کو تصوف سے کچھ زیادہ ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ تسبیح برابر ساتھ رہا کرتی تھی۔ جہاں موقع ملا، ٹہل کر یا بیٹھے بیٹھے تسبیح پڑھا کرتے تھے اور بعض تصوف کے مسائل پر گفتگو بھی فرماتے اور خاص خاص لوگوں کو کبھی کبھی تعویذ بھی دیدیا کرتے تھے۔

مولانا رح پہلی شادی کے بعد ہی حضرت قاری سید احمد صاحب شاہ جہاں پوری رح سے مرید ہو چکے تھے۔ موصوف خاندان نقشبندیہ کے ایک متشرع بزرگ تھے۔ مولانا کے خسر مولانا سید وحید الحق صاحب اور اطراف بہار کے بہت سارے لوگ جناب قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی سے مرید تھے۔ مولانا رح کے والد ماجد جناب قاری صاحب رح کو پٹنہ لاکر خود بھی مرید ہوئے تھے اور خاندان کے دوسرے لوگ بھی۔ مولوی احمد سجاد صاحب کو بھی موصوف ہی سے بیعت حاصل ہے۔

مولانا کا قد لانبا تھا۔ میرے خیال میں چھ پونے چھ فٹ سے کم نہ ہوگا۔ دبلے پتلے سانولا رنگ، چوڑا دہانہ، لانبی اور کچھ اونچی ناک، متوسط درجہ کی آنکھیں، جن میں ہر وقت محبت بھری رہتی تھی۔ لانبا چہرہ، اس پر کشادہ پیشانی، سر کے بال بہت نرم ہوا میں ریشم کی طرح اڑتے تھے۔ پیشانی کے اوپر کے بال غور و فکر کی نظر ہو گئے تھے۔ مونچھیں گھنی اور داڑھی ہلکی، رخساروں پر کم اور ٹھڈی پر زیادہ تھی۔

مولانا ہمیشہ بہت سادہ اور معمولی لباس پہنتے۔ پیر میں پرانی وضع کا معمولی جوتہ جو اکثر پھٹا رہتا تھا۔ پرانے ہی وضع کا کھدر کا لانبا کرتا جس میں گریبان کے دونوں طرف بڑی جیبیں جو ہر وقت کاغذ سے بھری رہتی تھیں۔ اس کے اوپر ایک بنڈی۔ سر پر کھدر کا ایک بڑا سا عمامہ جو خراب طریقہ سے بندھا رہتا تھا۔ یہ تو گرمی کا لباس ہوا۔ جاڑے میں عمامہ کے علاوہ یہی سب چیزیں موٹے اور معمولی ادنی کپڑے کی ہوا کرتی تھیں۔ داہنے ہاتھ میں ایک بھاری اور موٹی سی لکڑی جس کے نیچے وزنی لوہا لگا ہوا تھا۔ بائیں ہاتھ میں چھوٹا سا اٹیچی جس میں کاغذ روشنائی اور ضروری کاغذات بھرے رہتے تھے۔

مولانا کھانا بھی بہت سادہ اور معمولی کھاتے تھے۔ میرے علم میں اپنے اختیار سے

مولانا نے کبھی بھی اپنے لیے اچھے کھانے کا نظم نہیں کیا۔ اگر حساب لگایا جائے تو مولانا نے برسوں ہوٹل کی خمیری روٹی اور گائے کا کباب کھایا ہے۔ ایک دفعہ مجھے مولانا کے یہاں کھانے کا اتفاق ہوا۔ اس وقت مولانا پھلواری شریف میں کرایہ کا مکان لے کر اہل وعیال کے ساتھ مقیم تھے دسترخوان بچھا۔ گھر سے جو کھانا آیا اس کی فہرست یہ تھی۔ موٹے اور لال چاول کا پکا ہوا بھات تیل میں بگھری ہوئی پتلی دال اور آلو کا بھرتا جس میں پیاز پڑی تھی مگر بگھارا نہیں گیا تھا۔ مولانا نے محض میری وجہ سے ہوٹل سے گوشت منگوالیا تھا۔

مجھے کبھی ہنسہ جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اس لیے مولانا کے مکان کی صحیح تصویر تو نہیں کھینچ سکتا، معتبر ذرائع سے اتنا ضرور سنا ہے کہ پہلے تو اچھی حالت میں تھا لیکن آٹھ دس برس سے وہ بھی بُری حالت میں ہے۔ لیکن ۱۹۴۷ء میں جب مولانا نے وزارت قائم کی تھی تو میں پٹنہ آیا ہوا تھا اور نواب عبدالوہاب خاں وزیر مالیات کا مہمان تھا۔ میں اور نواب صاحب کے بھائی مسٹر وصی احمد خاں وکیل مولانا سے ملنے پھلواری شریف گئے۔ کچھ عرصہ سے مولانا نے پھلواری ہی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ مکان کرایہ کا تھا۔ مٹی کی دیواریں اور کھپریل کی چھت۔ اندر کتنی وسعت تھی اس کو تو میں نہیں کہہ سکتا، لیکن باہر جس میں مولانا تشریف فرما تھے، وہ دو دروازوں کی ایک کوٹھری تھی، ایک باہر سے آنے کے لیے اور ایک زنانخانہ میں جانے کے لیے۔ کوٹھری میں ایک طرف مٹی ہی کا اونچا چبوترہ تھا۔ اس پر ایک چارپائی پڑی ہوئی تھی جس کے سرہانے مولانا کا بستر بندھا ہوا رکھا تھا۔ چارپائی کے نیچے کھجور کی چٹائی بچھی تھی، اس پر قلم دوات، کچھ کتابیں اور مولانا کی وہی اٹیچی رکھی تھی۔ ایک طرف موٹے ٹین کے دو بکس تھے، ایک میں کتابیں دوسرے میں کپڑے، چبوترے سے نیچے ایک کونے میں مٹی کا گھڑا، وہیں پر تانبے کا ایک بڑا لوٹا اور دوسرے کونے میں مولانا کی وہی لکڑی کھڑی تھی۔ غرض یہ تھا صوبہ بہار

ہیں حکومت قائم کرنے والے کے گھر کا اثاثہ۔ خیر مجھے تو کوئی حیرت نہ ہوئی کہ میں مولانا سے واقف تھا، لیکن مسٹر وصی احمد خاں تو حیرت سے کھڑے رہ گئے۔ مولانا اسی کھرّی چارپائی پر بستر کا تکیہ لگائے کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے، اُٹھے اخلاق سے ملے، اسی چٹائی پر ہم سب بیٹھے۔ لوٹتے وقت راستہ میں مسٹر وصی احمد کہنے لگے کہ اس قسم کے لوگوں کے متعلق کتابوں میں ضرور پڑھا تھا۔ مگر دیکھا آج ہی ہے۔ اس منظر کو وصی صاحب آج تک بھول نہیں سکے۔

آخر وہی ہوا جو برابر ہوتا چلا آیا ہے اور ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ مولانا امارت شرعیہ کے کام سے ضلع چمپارن کا دورہ فرما رہے تھے۔ وہیں ملیریا میں مبتلا ہوئے۔ پھلواری واپس آئے ۹ روز بخار میں مبتلا رہ کر، ۷ ارشوال ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۸ نومبر ۱۹۴۰ء روز دوشنبہ پونے پانچ بجے شام کو رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے انسٹھ برس ساڑھے آٹھ ماہ عمر پائی، جسے مولانا کے ساتھ رہنے کا کچھ بھی موقع ملا ہے، وہ مولانا کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ ہر وہ شخص جس نے مولانا کی زندگی کا مطالعہ کیا ہے، وہ اس اعتراف پر مجبور ہے کہ اتنے بہتر دل و دماغ کا مالک، فکر و عمل کا ایسا جامع، ایثار و قربانی کا ایسا پتلا، علوم و فنون کا ایسا ماہر، خلوص و للّٰہیت کا ایسا مجسمہ اور پھر ان ساری بڑائیوں کے ساتھ ایسا منکسر اور متواضع شخص کم دیکھا گیا ہے۔

حضرت مولانا رحمہ کے محاسن کو بتلانے اور آپ کی سوانح کے ہر پہلو کو نمایاں کرنے کا کام چند اوراق میں نہیں ہو سکتا، اس کے لیے اچھی خاصی کتاب لکھنے کی ضرورت ہے، خدا کرے یہ آرزو جلد پوری ہو جائے۔

خدا مولانا کے مراتب بلند فرمائے اور ہم لوگوں کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

میں نے اس مضمون میں بڑی حد تک اپنی ذاتی معلومات پر بھروسہ کیا ہے، اور اس سلسلہ میں کافی مواد مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے بھانجے مولوی خلیل احمد صاحب کے اس تفصیلی خط سے ملے جو دریافت حالات پر موصوف نے مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی ناظم امارت شرعیہ کو لکھا تھا، اور مولانا موصوف سے مجھ کو ملا۔

حضرت اُستاذ کی یاد

مُختصر تعلیمی اور اخلاقی حالات

از ــــــ حضرت مولانا عبد الصمد رحمانی (نائب امیر شریعت)

۱۳۲۷ھ میں "هداية النحو" پڑھتا ہوا، میں حضرت استاذ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں الہ آباد حاضر ہوا تھا۔ یہ میری زندگی کا پہلا لمبا سفر تھا، جو بغیر کسی قائد اور سائق کے دفعۃً اور بغتۃً ہوا تھا۔

اب تک میں نے جو کچھ پڑھا تھا وہ استاذی حضرت مولانا حکیم محمد صدیق صاحب مدظلہٗ کے فیض صحبت کا اثر تھا۔ مولانا قصبہ باڑھ میں مطب کرتے تھے، اور میں اپنے گھر بازید پور سے روزانہ پڑھنے کے لیے حاضر ہوا کرتا تھا، اور کبھی کبھی اثنائے گفتگو میں کانپور اور کانپور کے مدارس عربیہ کا حال سنا کرتا تھا۔ اس زمانہ کے ماحول میں عموماً عربی طلبہ میں "تم خیرا" کی بیماری عام تھی اور اس سے میں بھی بری نہ تھا اسی بحران میں یکہ و تنہا گھر سے نکلا تو کانپور کا ٹکٹ لے کر سیدھا جامع العلوم پہنچا۔ مگر وہاں ٹک نہ سکا اور طبیعت غالباً اس وجہ سے گھبرائی کہ ان دنوں وہاں بہاری طلبہ بہت کم تھے۔

قدرت کی جانب سے نہ معلوم کس طرح الہ آباد کا قلب میں القا ہوا، اور میں

اُلٹے پاؤں الٰہ آباد واپس آیا تو یہاں حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ کو پایا۔

یہاں کی دنیا ہی دوسری تھی۔ مدرسہ سبحانیہ کا دارالطلبہ بہار کا ایک گاؤں معلوم ہوتا تھا۔ یہاں بھی گرچہ کوئی جانی پہچانی صورت نہ تھی مگر دیارِ غربت جیسی اجنبیت بھی نہ تھی، چونکہ وسط سال میں پہنچا تھا، اس لیے کسی جماعت میں شریک نہ ہو سکا، لیکن مولانا نے امتحان لیکر خارج از مدرسہ میری تعلیم کا انتظام فرما دیا۔ کافیہ تک پڑھا تھا، شرح جامی سے میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ درس میں داخل ہو گیا۔

مولانا کا طریقۂ تعلیم

میں جس دور میں حضرت استاذ کے حضور میں حاضر ہوا تھا، طریقۂ تعلیم میں عجیب قسم کی افراط و تفریط تھی، جو تمام مدارس عربیہ میں اِلّا ماشاء اللہ عام تھی۔ درس کے وقت اساتذہ کا معمول یا تو یہ تھا کہ پڑھنے والا ایک اندازکردہ مقدار میں عبارت پڑھ جاتا تھا اور پڑھانے والا اس کے متعلق ایک زوردار تقریر میں اس کے مطالب کو پیش کر دیتا تھا، اور اسی سلسلہ میں اعتراض و جواب اور اس کی ضروری تنقیحات کو بیان کر دیتا۔ اس کے بعد پڑھنے والا عبارت کا ترجمہ کرتا تھا اور اس طرح پردہ سبق ختم ہو جاتا تھا۔ یا یہ دستور تھا کہ پڑھنے والا ہونے والے سبق کی ایک دو سطریں پڑھ کر ترجمہ کرتا تھا، اور پڑھانے والا اس کا مطلب بیان کرتا۔ پھر اس عبارت پر جو ایراد و اعتراض ہوتا اس کو بیان کر کے جواب دیتا۔ پھر اسی طرح دو چار سطریں پڑھی جاتیں اور ان کا ترجمہ اور مطلب اور ایراد و اشکال اسی طرح بیان کیا جاتا۔ یہاں تک کہ اندازہ کردہ مقدار میں عبارت پوری ہو جاتی اور یہاں پہنچ کر سبق ختم ہو جاتا۔

پہلی صورت میں عملاً یہ نقص ہوتا تھا کہ طلبہ میں محاکات اور نقل کی استعداد تو تام ہو جاتی تھی اور کتاب کے ہر مسئلہ پر وہ ایک رواں دواں تقریر کے عادی تو ہو جاتے تھے مگر کتاب سے خصوصی مناسبت نہیں ہوتی تھی اور نہ قوت مطالعہ قوی ہوتی تھی اور بسا اوقات پڑھنے والا اس تفہیم پر بھی قابو نہیں رکھتا تھا کہ وہ جو کچھ کہا گیا ہے عبارت اس کی متحمل ہے؟ یا نہیں؟ اور اگر متحمل ہے تو اس کے لیے سبق کی کون سی عبارت محل اور ماخذ ہے۔ پھر اس کے علاوہ اگر اس کی محاکاتی تقریر کے بیچ میں اگر کوئی اشکال کر دیا جاتا تو میں نے دیکھا کہ یہ ساری تقریر اس طرح بکھر کر رہ جاتی تھی کہ اس کو سمجھنا مشکل اور دشوار ہو جاتا تھا کہ اس کی تقریر کے جس ٹکڑے پر یہ ایراد ہو رہا ہے۔ یہ کیوں ہو رہا ہے اور اس کا جواب خود عبارت میں موجود ہے یا نہیں؟

دوسری صورت میں عموماً عملاً یہ تو محسوس ہوتا تھا کہ طلبہ میں کتاب سے کافی مناسبت بھی ہے۔ قوت مطالعہ بھی ہے۔ وہ عبارت کا صحیح مفہوم بھی سمجھتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بڑی کمی دیکھنے میں آتی تھی کہ وہ اپنے دماغ میں کسی مسئلہ کے متعلق کوئی خاص روشنی نہیں رکھتا ہے اور نہ اس پر قدرت رکھتا ہے کہ وہ کتاب سے الگ ہو کر ایک سلجھی ہوئی تقریر میں اس چیز کی ترجمانی کرے جو صاحب کتاب کا مقصد ہے اور جو خود اس کے پڑھنے کا مطلوب و مقصود ہے۔

حضرت استاذ کا طریقۂ تعلیم اس افراط و تفریط سے الگ بین بین تھا وہ طلبہ کو کتاب سے اخذ مطلب پر زور دیتے تھے اور اس طرح ان کی قوت مطالعہ میں پختگی ہو جاتی تھی۔ اور کتاب سے خاصی مناسبت پیدا ہو جاتی تھی۔ استاذ مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ پڑھنے والے کے سامنے دو باتیں رہنی ضروری ہیں۔ ایک تو یہ کہ جس مسئلہ

کو تم کتاب میں پڑھ رہے ہو۔ پہلے اس کو کتاب سے سمجھو کہ صاحب کتاب اس مسئلہ کے متعلق کیا کہہ رہا ہے اور اس سمجھنے میں جو کچھ سمجھو اس عبارت سے سمجھو، اور کسی خیال کو اپنی طرف سے زبردستی اس میں نہ ٹھونسو۔ اس کے سمجھ لینے کے بعد دوسری چیز یہ ہے کہ یہ سمجھو کہ اصل مسئلہ کی حقیقت کیا ہے؟ اور جب اصل مسئلہ کی حقیقت سمجھ لو، تو اس کے بعد یہ بھی دیکھو کہ صاحب کتاب سے اس حقیقت کے سمجھنے میں چوک تو نہیں ہوئی ہے۔ پس حضرت استاذ پہلے کتاب کی تفہیم فرماتے۔ پھر نفس مسئلہ کی طرف رہنمائی فرماتے، اس طرح پڑھنے والے میں تحقیق، تلاش، محنت، مطالعہ فکر کا جذبہ پیدا کر دیتے تھے اور پڑھنے والے کے دماغ کی تربیت فرماتے تھے۔ حضرت استاذ طلبہ کو نہ تو بے محابا، بگ ٹٹ، ایسا رواں دواں دیکھنا چاہتے تھے کہ بے خبری میں ہر موڑ اس کے لیے خطرناک خندق بن جائے اور اس کے لیے مغلطہ کا باعث ہو۔ اور نہ وہ طلبہ کے لیے یہ پسند فرماتے تھے کہ صرف کتاب کا رٹو ہو کر رہ جائے۔ اور دماغ اس جوہر لطیف سے خالی رہے، جو علم کا مقصود و مطلوب ہے۔

استاذ رحمۃ اللہ علیہ کے طریقۂ تعلیم کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ اپنے عمیق تعلیمی تجربہ اور تبحر کی بنا پر اوّل نگاہ میں پڑھنے والے کی صلاحیت، اس کی استعداد، اس کی خامی اور اس کے نقص کو بھانپ لیتے تھے اور سبق کے وقت سب سے پہلے اس کی اس خامی کا ازالہ فرما دیتے تھے، جس کا ہونے والے سبق سے تعلق ہوتا تھا، تاکہ فہم سبق کی راہ میں دشواری نہ رہے۔ اور اس کے لیے ایسا پیرایہ اختیار فرماتے تھے کہ دوسرے ہم سبق کو اس کا پتہ بھی نہیں چلتا تھا اور اس کے دل کی گرہ کھل جاتی تھی۔

مولانا کی ایک عجیب خصوصیت جو مرتے دم تک ان کے ساتھ رہی وہ ان کی علو ہمتی تھی۔ وہ کثرت مشاغل سے نہ گھبراتے تھے، نہ تھکنا جانتے تھے۔ مدرسہ کے اوقات میں

درس دینے کے علاوہ کثرت اسباق کے باعث صبح کی نماز کے پہلے اور نماز کے بعد بھی پڑھاتے تھے، پھر عصر کے بعد مولانا ایک شیعہ صاحب کو ریاضی اور معقولات پڑھاتے تھے، یہ باوجود رئیس ہونے کے روزانہ پابندی سے آیا کرتے، اور اس کی وجہ مولانا رح کی وہی تعلیمی خصوصیت تھی جو میں اوپر عرض کر آیا ہوں۔ یہ ان کے طرز تعلیم کے دلدادہ تھے، اور اکثر مسند درس سے استفادہ کے بعد مولانا کی خدمت میں حاضر ہو کر مولانا کے ہو رہے تھے۔ مولانا بھی ان سے بہت خوش رہتے کہ یہ انگریزی داں تھے۔ مولانا کو روز روز کی خبریں اور ممالک اسلامیہ کی حالات بیان کرتے تھے۔ پھر اسی کے ساتھ مولانا کے ذمہ افتار کی خدمت بھی تھی۔ اکثر دن کے کھانے کے بعد کتب خانہ میں جو دارالطلبہ کی نیچے کی منزل میں تھا تشریف لے آتے اور اہم استفتار کا جواب تحریر فرماتے تھے۔

مولانا کا علم وفضل

اس دَور میں عموماً طلبہ میں معقولات کا ذوق زیادہ تھا اور اس کی جانب دلچسپی میرے خیال میں افراط کی حد سے بھی زیادہ تھی۔ اسی بنا پر عموماً اس دَور میں طلبہ میں مولانا کی ممتاز حیثیت معقولی ہونے کی تھی اور یہ واقعہ ہے کہ مولانا اس فن میں ناقدانہ نظر رکھتے تھے اور ہر مسئلہ میں مولانا کی رائے قول فیصل کا درجہ رکھتی تھی۔

مگر حقیقت یہ تھی کہ مولانا کو قدرت کی جانب سے ایسی صلاحیت واستعداد کی نوازش ہوئی تھی کہ وہ بلاغت، معانی، ادب میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔ مجھ کو یاد ہے کہ دارا گنج کے مدرسہ کے ملاحظہ کے لیے جس کو مولانا نے دارا گنج کی وسیع اور پرشوکت شاہی مسجد میں جو لب دریا واقع ہے، قائم کیا تھا اور ارادہ یہ تھا کہ اس کو تعلیم کے ساتھ

صنعتی مدرسہ بنایا جائے، جب ایک جج صاحب (جن کا نام نامی شاید کرامت حسین یا اسی طرح کا کوئی دوسرا نام تھا) تشریف لائے تھے اور مولانا کو ان کی تشریف آوری کی اطلاع کل پندرہ بیس منٹ پہلے ہوئی تھی، تو اس لحاظ سے وہ ذی علم تھے اور عربی ادب سے خاص ذوق رکھتے تھے۔ مولانا نے ارتجالاً عربی کا ایک بلیغ قصیدہ لکھا تھا، جس کو سن کر جج صاحب ممدوح بہت متاثر ہوتے تھے۔

مولانا کا قرآن مجید سے شغف

قرآن مجید سے مولانا کو طبعی ذوق تھا وہ مجھ سے اکثر فرماتے تھے کہ میں جب قرآن مجید تلاوت کرنے بیٹھتا ہوں تو بہ مشکل گھنٹہ آدھ گھنٹہ میں ایک صفحہ کی تلاوت کرتا ہوں قرآن کی بلاغت، اس کا عمق، پھر اس کے احکام، پھر احکام کی روح اور اس کا مناط۔ پھر اس کے ماتحت اس کے فروع۔ پھر اس فروع کے تنوعات، پھر ان میں باہمی تفاوت کی بوقلمونی، اس طرح ایک ساتھ سامنے آنے لگتی ہیں کہ میں اس میں کھو جاتا ہوں، اور اکثر ایک ہی دو آیت میں وقت ختم ہو جاتا ہے اور تھک کر تلاوت ختم کر دیتا ہوں۔

ایک دفعہ فرماتے لگے کہ جب یہ مسموم ہوا چلنے لگی کہ ہر مسئلہ کا ثبوت قرآن سے طلب کیا جانے لگا تو اس زمانہ میں تلاوت کے وقت جزئیات فقہ اور فروعات اسلامی کے مآخذ کے اخذ کی طرف ذہن کا امالہ ہو گیا، تو کچھ دنوں کے مطالعہ کے بعد خدا کی جانب سے یہ نوازش ہوتی کہ جب میں فقہ کے کسی باب کے فروعی مسائل کے ثبوت کی طرف توجہ کرتا تو آسانی سے ماخذ کی طرف رہنمائی ہو جاتی۔ ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء والله ذو الفضل العظيم۔

زرعی بل کے موقع میں جب اسمبلی میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ اوقاف پر شرعاً زرعی ٹیکس عائد نہیں کیا جاسکتا ہے تو میں نے پوچھا کہ حضرت اس کے لیے قرآن مجید میں کیا ماخذ ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ اس کا ماخذ:

فَمَنْ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۔ (بقرہ ع ۲۳)۔

کیوں کہ کسی طرح کی تبدیلی جب وصیت میں جائز نہیں ہے، جو مرض الموت کی حالت میں لوجہ اللہ کرتا ہے، تو پھر وقف میں بدرجہ اولیٰ جائز نہیں ہوگی، جو صحت اور طمانیت کی حالت میں خدا کی راہ میں وقف کرتا ہے۔ اسی اصول پر "شرط الواقف کالنص" کا ضابطہ ہے۔

مولانا کی نکتہ سنج اور دقیقہ رس ذہانت حقیقت رسی میں سحر طرازی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ مجلسی گفتگو، نجی صحبتوں میں بسا اوقات اس طرح کے اشارات کر جاتے تھے، کہ حیرت ہو جاتی تھی۔ ایک دفعہ فرمایا کہ مغضوب اور ضالین کی جماعت جس سے یہود و نصاریٰ مراد ہیں، کفار و بت پرست کے مقابلہ میں ان سے تبری کو اس قدر اہمیت کیوں دی گئی ہے کہ سورہ فاتحہ جس کو جزء قرار دیا گیا، جس کو رات دن میں ۳۲ مرتبہ ہم نماز میں پڑھتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ وجہ یہ ہے کہ قرآن کی نظر میں ان کی جماعتی فطرت یہ ہے کہ ان میں حق کے قبول و انفعال کی استعداد نہیں ہے، اور مشرکین کی جماعتی فطرت میں حق کے قبول و انفعال کی استعداد ہے۔ یہود و نصاریٰ کے متعلق تو قرآن کا نظریہ یہ ہے کہ

لن ترضیٰ عنک الیہود ولا النصاریٰ حتیٰ تتبع ملتہم (بقرہ ع ۱۴)

یہود اور نصاریٰ تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کے

دین کے پیرو نہ بن جاؤ۔

اور مشرکین کے متعلق قرآن کا نظریہ یہ ہے کہ

ودوا لوتدھن فیدھنون۔ (قلم ع)

وہ چاہتے ہیں کہ اگر تم نرم ہو تو وہ بھی نرم ہو جائیں۔

ایک دفعہ میں نے عرض کیا کہ

اِنْ زَلَلْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْكُمُ الْبَيِّنَاتُ فَاعْلَمُوْا

اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۔ (بقرہ ع ۲۵)

کے متعلق علامہ زمخشری نے یہ واقعہ لکھا ہے کہ کسی نے غلطی سے عزیز حکیم کی جگہ غفور رحیم پڑھ دیا تو ایک بدوی نے سن کر کہا کہ یہ خدا کا کلام نہیں ہو سکتا ہے وجہ اس کی علامہ زمخشری نے یہ بیان کی ہے کہ زلت اور لغزش کے بعد ارباب دانش رحم و مغفرت کا ذکر نہیں کرتے ہیں، کیوں کہ یہ اس کو گناہ پر جری بنانے کو مستلزم ہوگا۔

حالاں کہ قرآن مجید کی دوسری آیتوں میں رحم مغفرت کا ذکر خطا کاروں کی خطا کاری کے بعد مذکور ہے۔

مولانا نے فرمایا: بدوی کے انکار کی وجہ یہ نہ تھی، بلکہ وہ فاعلموا کا بلیغ تیور ہے، جو اس جگہ رحم و مغفرت کے ذکر کے منافی ہے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی اس بلاغت پر بے اختیار زبان سے نکل آیا ؎

توئی چناں کہ توئی ہر کسے کجا داند

احادیث کے متعلق مولانا کا نظریہ

احادیث کے متعلق مولانا کا نظریہ بہت بلند تھا۔ مولانا فرماتے تھے کہ ہر حدیث قرآن مجید کی کسی نہ کسی آیت کی تفسیر ہے، نیز یہ کہ ہر حدیث مشکوٰۃ نبوت کی ہی تنویر کی روشنی ہیں جو بما اراك اللہ کے ماتحت آپ کو حاصل تھی۔ اس امر پر زبردست دلیل ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تشریح و تبیین آیات قرآنی کی فرمائی ہے، سب کے لیے آپ نے قرآن کے الفاظ میں اشارات پائے ہیں۔ جس طرح مجتہدین آیات منصوصہ میں مدار حکم کے اشارات پاتے ہیں۔ پھر اس پر قیاسات کی بنیاد رکھتے ہیں اور فروعی احکامات کا استخراج کرتے ہیں۔ اس لیے مولانا کی رائے تھی کہ ہر حدیث کا تعلق قرآن سے بتانا چاہیے، اور ہر نوع کے مسائل کے متعلق سب سے پہلے قرآن سے جو کچھ ثابت ہے اس کو زیر بحث لانا چاہیے۔ اس کے بعد احادیث سے جو کچھ سمجھا ہے اس کو بتانا چاہیے، اس کے بعد طلبہ کو اس کی طرف رہنمائی کرنی چاہیے کہ مسئلہ کے اس خاص نوع میں مجتہدین کی کیا خدمات ہیں اور کیوں کریں اور ان کا مدار کیا ہے۔

مولانا کا فقہ میں درجہ

مولانا جس طرح اختلاف احادیث کے باب میں جمع اور تطبیق سے کام لیتے تھے اور اختلاف احوال اور مقتضائے ماحول پر اس کو محمول فرماتے تھے یا اختلاف مدارج یعنی اباحت، رخصت، عزیمت کو سبب قرار دیتے تھے۔ اسی طرح فقہاء کے مختلف اقوال میں جمع اور تطبیق سے کام لیتے تھے۔ اور امام صاحب اور صاحبین کے اختلاف کو نیز دوسرے ائمہ امام شافعی رحؒ وغیرہم کے اختلاف کو خصوصاً معاملات میں مقتضائے ماحول اور اسی

طرح کے دوسرے اسباب پر محمول فرماتے تھے اور کہتے تھے مختلف جہات کی بنا پر جو مختلف احکام ہیں ان میں واقعیت کے اعتبار سے دراصل کوئی اختلاف ہی نہیں ہے، اسی نظریہ پر مولانا یہ ہدایت فرماتے رہتے تھے کہ مفتی کو امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب کے باب استصلاح کو ضرور مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ حوادث آئندہ و جاریہ کے متعلق وہ بصیرت کے ساتھ فتویٰ دے سکیں۔

یہی وہ خصوصیات تھیں جن کی بنا پر مولانا ان مسائل میں جو ارتقائی اسباب کی بنا پر آئے دن نئی نئی صورتوں میں رونما ہوا کرتے ہیں، بلاتکلف صائب رائے دیتے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کو پہلے سے سوچ بیٹھے ہیں۔ اور اس کے شواہد اور نظیر پر غور و فکر کے تمام مراحل کو طے فرما چکے ہیں۔

جمعیۃ علماء ہند اور اس طرح کی دوسری کمیٹیوں کی مجلس منتظمہ اور مجلس عاملہ پر ایک مرتبہ گفتگو آئی اور اس سلسلہ میں یہ مسئلہ بھی سامنے آیا کہ موجودہ طریقہ پر انتظامی امور میں کثرت رائے سے جو فیصلہ کیا جاتا ہے یا صدر کی رائے کو ترجیحی حیثیت دی جاتی ہے اس کی کوئی نظیر عہد رسالت یا خلافت راشدہ میں ہے تو مولانا نے فوراً جواب دیا کہ ہاں اس کی نظیر وہ کمیٹی ہے جس کو حضرت عمر رضہ نے انتخاب خلیفۂ سوئم کے لیے مقرر کیا تھا اور فرمایا تھا کہ اگر چھ آدمیوں کی کمیٹی میں سے تین تین دونوں طرف ہو جائیں تو عبدالرحمٰن جس طرف ہوں ان کو خلیفہ مقرر کر دو، ورنہ اکثریت کی رائے پر عمل کرو۔

باتیں لکھنے کی بہت ہیں، لیکن اس رسالہ کی تنگ دامانی اس کی متحمل نہیں ہے

---

(۱)

میرے خیال میں مولانا کی اصلی خصوصیت "تفقہ فی الدین" کی خدا داد دولت تھی، جس میں وہ فقیہ اور یگانہ تھے۔ مولانا جس وقت الٰہ آباد سے گیا کو مراجعت فرمارہے تھے اور عمائدین کی جماعت مولانا کو رخصت کرنے کے لیے اسٹیشن پر آئی تھی تو ہر شخص کی زبان پر یہی تھا کہ الٰہ آباد سے "فقہ" رخصت ہو رہا ہے۔

مراجعت گیا

مولانا الٰہ آباد چھوڑ کر گیا (صوبہ بہار) کیوں تشریف لائے۔ اس کے اسباب سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ دراصل اس کا باعث ایک تو مولانا کا تعلیمی نظریہ تھا۔ دوسرے مدارس عربیہ کی زبوں حالی اور علمی کیفیت کی روز بہ روز انحطاط پذیری تھی، جو مولانا کو بے چین اور مضطرب رکھتی تھی۔ مولانا چاہتے تھے کہ

(۱) موجودہ نصاب بدل دیا جائے۔

(۲) صوبہ بہار کے تمام مدارس میں ایک نصاب جاری کیا جائے۔

(۳) مدارس عربیہ کے امتحان کے لائق علماء کی ایک مجلس ممتحنہ ہو، جو امتحان کے سوالات مرتب کرے اور ان کے نتائج کو شائع کرے۔

(۴) تمام مدارس میں جو بڑا مدرسہ ہو اس کو جامعہ ملیہ قرار دیا جائے۔

(۵) ہر قابل اعتنا، مدرسہ کے ذمہ ایک مخصوص فن دے دیا جائے، جس کی تکمیل وہاں ہو اور ابتداء ہی سے غیر محسوس طریقہ پر اس کا وہاں کے ہر درجہ میں لحاظ رکھا جائے۔ مثلاً کسی مدرسہ کا خصوصی فن حدیث ہو، کسی کا فقہ ہو، کسی کا قرآن ہو وغیرہ وغیرہ۔

ان جملہ وجوہ کے ساتھ بہاری طلبہ کے اصرار کو بڑا دخل تھا، جو ہمیشہ مولانا کو مراجعت گیا کے لیے اُبھارتے رہتے تھے کہ جب تک آپ معیاری حیثیت کی تعلیم گاہ کی بنیاد رکھ کر جس میں کسی کا دخل نہ ہو، نمونہ قائم نہیں کر دیں گے اور براہ راست جد و جہد کو کام میں نہیں لائیں گے مدارس عربیہ کے بوسیدہ نظام میں انقلاب پیدا نہیں ہوگا۔

بالآخر مولانا نے اس دعوت رنج و محن کو قبول کر لیا اور گیا مراجعت کے لیے تیار ہو گئے اور سب سے پہلا وفد دو شخصوں کا جس میں ایک راقم الحروف اور دوسرے مولوی احمد اللہ صاحب آبگلوی (جو ان دنوں دائرۃ المعارف حیدرآباد میں برسر خدمت ہیں) گیا روانہ کیا۔ تاکہ کسی مناسب مکان کا مدرسہ کے قیام کے لیے پہلے سے انتخاب کر لیا جائے۔

ہم لوگوں نے ایک مکان کو مناسب سمجھ کر منتخب کر لیا اور مولانا کو اطلاع دیدی۔ تقریباً پندرہ بیس دن کے بعد مولانا پندرہ، بیس بہاری طلبہ کی ایک جماعت کے ساتھ گیا تشریف لے آئے اور ظفر منزل کے سامنے ایک دو منزلہ مکان کرایہ پر لے لیا گیا۔ وہی مدرسہ بھی تھا اور وہی دار الطلبہ بھی۔

ابتدائی مشکلات

مولانا کا حال یہ تھا کہ وہ پس ماندہ کرنا نہیں جانتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں جو کچھ پڑتا تھا وہ خرچ ہو جاتا تھا۔ الہ آباد سے روانہ ہوئے تو جو کچھ ان کے پاس تھا ساتھ آنے والے طلبہ کے ٹکٹ اور ضروری مصارف پر خرچ کر دیا۔

تعاون باہمی

یہاں پہنچ کر قیام کے بعد سب سے پہلا اہم مسئلہ طعام کا تھا جس کا حل

یہ کیا گیا کہ جس کے پاس جو کچھ تھا، وہ سب ایک جگہ جمع کر دیا گیا اور اسی سے قوت لایموت کا یہ انتظام کیا گیا کہ اکثر کھچڑی اور کبھی صرف خشکہ پکا لیا جاتا تھا، اس کو سرخ مرچ کے بھرتہ کے ساتھ جو آگ پر بھون لی جاتی تھی اور اس میں نمک ملا دیا جاتا تھا۔ مولانا ایک دسترخوان پر بلا تکلف طلبہ کے ساتھ بیٹھ کر کھا لیتے تھے، اور مولانا کی پیشانی پر کبھی شکن نہیں پڑتی تھی۔ مجھ کو یاد ہے کہ ایک عید ایسی بھی گذری تھی کہ مولانا مدرسہ کی ضرورت سے کہیں باہر تشریف لے گئے تھے، اس روز کھانے کا کوئی سامان نہ تھا۔ صرف چند سیر گیہوں تھے، ان ہی کو بھون کر صوم عید کی حرمت سے گلو خلاصی کر کے صبر و شکر کے ساتھ عید کا دوگانہ ادا کیا گیا تھا۔

عزیمت و استقلال

ان غیر معمولی حالات میں مولانا کو میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ وہ اس رنج و محن کے کٹھن ایام میں کبھی بھی مایوس ہوتے ہوں یا یہ کہ ان کو کبھی خیال ہوا ہو کہ بیٹھے بٹھائے کیوں الہ آباد کی طمانیت کی خوش عیش اور خوشگوار زندگی کو چھوڑ کر اس دردسر کو خریدا۔ مولانا ہمیشہ پُر امید رہتے تھے اور طلبہ کو پر امید رکھتے تھے مشکلات سے نہ گھبراتے تھے، نہ کام کے ہجوم سے پریشان ہوتے تھے۔ ان ایام میں وہ تنہا سب کام انجام دیتے تھے۔ خود ہی مدرسہ کے مہتمم بھی تھے، مدرس بھی تھے، سفیر بھی تھے اور طلبہ کے اتالیق بھی تھے اور ان کے غمگسار اور مربی بھی تھے۔

تواضع اور خاکساری

پھر ان سب باتوں کے باوجود عملاً وہ مل جل کر رہنے میں اتنے خاکسار اور متواضع

تھے کہ وہ ان امور میں بھی شریک ہوجاتے تھے جو تقسیم کار کے اصول پر ہم لوگ اپنے ذمہ لیتے تھے اور یہ مولانا کی طبیعت ثانیہ تھی، وہ اس میں نہ اپنے لیے عار سمجھتے تھے اور نہ ان کو جھجک ہوتی تھی، پھر یہ انداز مرتے دم تک رہا اور مولانا کی زندگی کے ہر دور میں یہ خصوصیت نمایاں رہی۔

مدرسہ انوار العلوم کی عمارت

مدرسہ انوار العلوم گیا، مولانا کی انتھک کوششوں اور اخلاص کے باعث جب پروان چڑھا۔ عمائدین شہر کی اچھی خاصی توجہ بھی اس کو حاصل ہوگئی اور مسماۃ مریم نے (خدا ان کو جنت نصیب کرے) مدرسہ کے لیے کچھ زمین، کچھ مکانات، کچھ جائداد وقف کیا اور مولانا کرایہ کے مکان سے جو ظفر منزل کے سامنے تھا، اٹھ کر اس موقوفہ مکان میں چلے آئے اور طلبہ کے قیام وطعام کا بھی بہتر اور قابل اطمینان سامان ہوگیا تو مولانا کا خیال ہوا کہ مدرسہ کے لیے ایسی عمارت کی بنیاد رکھی جائے جو درس گاہ اور طلبہ کے قیام گاہ دونوں کا کام دے۔ لیکن اس وقت باوجود ہر طرح کی سہولت کے اتنی مالی وسعت نہ تھی کہ اتنی بڑی عمارت جو اس وقت موجود ہے، اس کے ہر طرح کے مصارف کا بار اٹھالیا جاتا۔ اس لیے مولانا رات کو یہ کرتے کہ اتنی اینٹیں جو کل دن کے لیے کافی ہوجائیں اینٹ کے بھٹہ سے جو عمارت کے قریب ہی احاطہ باغ میں تیار کیا گیا تھا، طلبہ کو ساتھ لے کر ڈھوتے تھے اور بنیاد کے پاس لاکر جمع کردیتے تھے۔ اس طرح روز روز کا کام بھی سہولت اور کفالت سے ہوتا تھا اور طلبہ میں عمل کی گرم جوشی رہتی تھی، اور نہ کسی کو عار ہوتا تھا، اور نہ کسی میں تنگ دلی پیدا ہوتی تھی۔ ہر شخص مولانا کے ساتھ خوشی خوشی اس کو انجام دیتا تھا اور اپنے لیے سعادت سمجھتا تھا، اور یہ سب مولانا کے اخلاص اور عملی زندگی کی برکت تھی۔

چمپارن کا ایک واقعہ

اسی طرح مجھ کو یاد ہے کہ زلزلہ کے موقع میں جب مولانا چمپارن کے دیہاتی علاقہ میں تشریف لے گئے اور غریب کسانوں کی حالت زار دیکھ کر یہ محسوس کیا کہ یہ خانماں برباد تنگدستی کے ہاتھوں اس قابل نہیں ہیں کہ مزدوری ادا کر کے اپنے اور اپنے بال بچوں کی حفاظت کے لیے کوئی جھونپڑا ہی بنا سکیں، تو مولانا نے تعاون باہمی کے اصول پر بعض جگہ اس طرح کام شروع کرایا کہ گاؤں کی آبادی کو متعدد جماعتوں پر تقسیم کر دیا اور ہر جماعت کا فریضہ قرار دیا کہ وہ باہم مل کر اپنی جماعت کے ہر فرد کا نوبت بہ نوبت چھپر، ٹھاٹھ، ٹٹی وغیرہ بنائیں اور عملاً اس میں سرگرمی یوں پیدا کیا کہ خود بھی ان کے ساتھ بیٹھ کر دن بھر مزدور کی طرح ٹھاٹھ بنانے بیٹھتے اور ہاتھ میں رسی اور چاقو لیے ہوئے ٹھاٹھ کی بندھن باندھا کرتے تھے۔

خودداری اور غیوری

جماعتی معاملات میں اس خاکساری اور تواضع کے ساتھ ذاتی معاملہ میں مولانا انتہا درجہ کے خوددار اور غیور تھے۔ شاید یہ کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ مولانا کی زندگی نہایت عسرت کی زندگی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ ابتداء میں مولانا کا گھر دال روٹی میں خوشحال گھرانوں میں تھا۔ معقول کاشت کاری تھی۔ ہر طرح کی وسعت اور فارغ البالی تھی۔ دو چار ملازم اور کام کرنے والے گھر پر ہمیشہ مصروف خدمت رہتے تھے، مگر یہ سب کچھ اس زمانہ میں تھا جب مولانا مدرسہ اسلامیہ بہار شریف میں مدرس تھے۔ چنانچہ جب کبھی ایسا اتفاق ہوتا تھا کہ کسی وجہ سے ہفتہ دو ہفتہ کے لیے مدرسہ بند ہو جاتا تھا تو مولانا ایسے

پندرہ بیس طلبہ کو جن کے اسباق کا ناغہ آپ کے نزدیک نامناسب معلوم ہوتا تھا، اپنے ساتھ اپنے مکان بنہسہ لے جاتے تھے اور سب کے ناشتے اور کھانے کے خود ہی کفیل ہوتے تھے اور ان کو وہیں پڑھاتے تھے۔

اس کے بعد جب وہ دور آیا کہ مولانا جماعتی اور دینی کاموں میں ایسے منہمک ہوئے کہ اس کی طرف سے بالکل بے توجہی ہو گئی تو آہستہ آہستہ کاشت کاری خراب ہو گئی اور محض خراب نہیں بلکہ بربادی کی حد تک پہنچ گئی، یہاں تک کہ اس کی پیداوار سے زمین کی مالگذاری بھی ادا نہ ہو سکی اور کچھ زمین غالباً نیلام بھی ہو گئی۔

مولانا کی زندگی موجودہ حالت میں بالکل وجہ کفاف پر تھی۔ مگر اس حالت میں بھی دوسروں کے لیے فیاض اور اپنے احباب کے لیے مہمان نواز تھے۔ اور مجھ کو ذاتی طور پر اس کا علم ہے۔ مولانا اس سلسلہ میں مقروض بھی ہو جاتے تھے، مگر شاید ان کے خاص لوگوں میں سے بھی بہت کم لوگ ہیں، جن کو مولانا کی اس غمگین زندگی کی اطلاع ہو۔

اس پر بھی مولانا کی خودداری کا یہ حال تھا کہ کسی کا احسان مند ہونا پسند نہیں فرماتے تھے۔ نواب خان بہادر عبدالوہاب خاں صاحب مونگیر نے مجھ سے بیان کیا کہ میں نے تنہائی میں مولانا سے ایک دفعہ کہا کہ مجھ کو اس کا موقع دیجئے کہ میں آپ کی خدمت کر کے اپنے لیے سعادت حاصل کروں۔ تو مولانا نے فرمایا کہ اس سے مجھ کو معاف رکھیے، اس سے ہمارے اور اللہ کے درمیان توکل کا جو رابطہ ہے اس میں خلل واقع ہو جائے گا نواب صاحب نے مجھ سے کہا کہ اس کے بعد میری ہمت نہیں ہوئی کہ میں ایک لفظ زبان پر لاؤں۔

مروت وتلطف پھر میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی تھی۔ جب میں یہ دیکھتا

تھا کہ عین اس حالت میں کہ مولانا خود مقروض ہوتے تھے۔ ان کے بعض خاص احباب جب ان سے قرض مانگتے تھے تو خودداری اور مروت کا یہ عالم تھا کہ انکار نہیں فرماتے تھے، بلکہ قرض لے کر ان کو قرض دیتے تھے اور ایک حرف زبان پر نہیں لاتے تھے، جس سے اس کا وہم بھی ہو کر ان کو کسی طرح کی پریشانی لاحق ہے۔ مولانا کی طبیعت بہت حساس واقع ہوئی تھی اس لیے اس کا پورا پورا خیال رکھتے تھے۔ اس کو میری حالت کا احساس نہ ہو، ورنہ اس کو ندامت ہوگی کہ پریشانی کی حالت میں مولانا کو پریشان کیا۔ اس معاملہ میں مولانا صحیح طور پر اس کے مصداق تھے کہ

یُؤْثِرُوْنَ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ کَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (حشر ع)

وہ دوسروں کو اپنی ذات پر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ اپنے اوپر فاقہ ہو۔

پھر مروت کے ساتھ تلطف کا یہ عالم تھا کہ احباب تو احباب وہ بدخواہ بھی جن کو مولانا اچھی طرح جانتے اور پہچانتے تھے، جب مولانا کے حضور میں آتے تھے تو مولانا اس طرح پیش آتے تھے کہ گویا ان سے کوئی شکوہ ہی نہیں ہے اور نہ کوئی تکلیف ہی ان سے پہنچی ہے۔

اگر یہ احساس مجھ کو مانع نہ ہوتا کہ مولانا کی روح کو اذیت ہوگی کہ کیوں میں نے ان لوگوں کے ستر حال کا لحاظ نہیں کیا، تو میں ان کی نشان دہی کرتا اور اس سلسلہ میں مروت و تلطف کے چند واقعات لکھتا۔

ہو سکتا ہے کہ جن کو آج ہم نہیں لکھنا پسند کرتے ہیں، کل یہی واقعات مولانا کے سوانح نگار کی زبان قلم پر آجائیں۔

غیرت دینی مولانا ذاتی معاملات میں جس طرح انتہا درجہ کے بامروت تھے،

اور تسامح اور درگذر کے خوگر تھے، دینی معاملات میں وہ انتہا درجہ کے غیور تھے اور عفو و درگذر، تسامح اور تلطف کو بالکل جائز نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اس کو مداہنت فی الدین سمجھتے تھے۔ پھر اس میں نہ شخص کی پرواکرتے تھے اور نہ جماعت کی، نہ اپنوں کی پرواکرتے تھے نہ غیروں کی۔

چنانچہ ۱۹۱۹-۲۰ء میں جو ہندو مسلم اتحاد کا دور تھا۔ جب یہ اتحادی مظاہرہ شرعی نقطۂ نگاہ سے اعتدال سے گذر کر افراط و تفریط کی حد تک پہنچ گیا، یہاں تک کہ ایک طرف انفرادی طور پر بعض مسلمان لیڈروں نے جوشِ اتحاد کے مظاہرہ میں پیشانیوں پر قشقہ لگا لیا اور کاندھوں پر ارتھی اٹھالیا اور دوسری طرف جماعتی حیثیت سے مسلم لیگ نے اپنے آل انڈیا اجلاس امرتسر ۱۹۱۹ء میں قربانی گاؤ کے ترک پر تجویز[ع] پاس کردی جو آج تک مسلم لیگ کے دفتری ریکارڈ میں موجود ہے اور اس کی تنسیخ عمل میں نہیں آئی ہے۔

تو مولانا کے تحمل سے یہ باہر ہو گیا اور سب سے پہلے اس کے غلط اثرات کا احساس کیا اور بلا خوف لومۃ لائم یہ اعلان کیا کہ

> غیر مسلموں سے مصالحت و موادعت کا منشا کیا ہے۔ احکام مذہب، شعار ملت، خصائص قومی کی حفاظت اور اپنے مخصوص اخلاق حسنہ

ع آل انڈیا مسلم لیگ کی تجویز کے الفاظ یہ ہیں:۔

آل انڈیا مسلم لیگ کی یہ رائے ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ اہل ہنود نے جس نیک رویہ کا اظہار کیا ہے اس کے اعتراف اور ہندوؤں اور ہندوستان کے مسلمانوں کے درمیان رشتۂ اتحاد کو زیادہ مضبوط کرنے کی غرض سے بقرعید کے موقع پر جہاں تک ممکن ہو سکے گائے کی قربانی کے بجائے دوسرے جانوروں کی قربانی کی جائے۔ (روئداد آل انڈیا مسلم لیگ اجلاس امرتسر ص ۱۲)

ذریعہ سے ان قوموں میں تبلیغ و دعوت۔

اس لیے اگر ضرورت ہو تو دنیا کی بہتر سے بہتر اور قیمتی سے قیمتی چیز غیر مسلموں کی مصالحت پر قربان کردی جاسکتی ہے، ان کے دلوں میں گھر کرنے کے لیے اپنے گھر کی ساری دولت لٹادی جاسکتی ہے۔ مگر احکام اسلام، شعار ملت، حقوق و خصائص قومی میں سے چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی نہیں چھوڑی جاسکتی ہے۔ کیوں کہ یہ دنائت فی الدین ہے، اور نہ غیر مسلموں کے مخصوص مراسم کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ یہ شرک فی الاسلام اور فنائے قومیت اور تقویت مقاصد اسلام ہے۔

علمائے بہار کے متفقہ فتویٰ کی ترتیب

اور اسی کے ساتھ مولانا نے صدر کی بے اعتدالیوں کے متعلق ایک فتویٰ مرتب فرمایا اور اس کو جمعیۃ علماء بہار کے اجلاس دربھنگہ ۱۳۳۹ھ میں پیش کیا جو متفقہ طور پر منظور کیا گیا اور تمام علماء کرام نے اس فتویٰ پر اپنے دستخط ثبت فرمائے۔ مولانا بروقت اس کو رسالہ کی شکل میں " علماء بہار کا متفقہ فتویٰ " کے نام سے دو ہزار کی تعداد میں شائع کیا۔ اس تاریخی فتویٰ میں اور بے اعتدالیوں کے ساتھ قشقہ اور ترک ذبح گاؤ پر بھی استفتاء کیا گیا تھا۔ بعض اقتباس بلفظہ حسب ذیل ہیں:

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین امور مفصلہ ذیل کے متعلق کہ شرعاً یہ امور کسی مسلمان کے لیے جائز ہیں یا نہیں؟

(۱) قشقہ لگانا و جلوس رام لیلا وغیرہ و ہندو کے دیگر مراسم مذہبی میں شریک ہونا کنٹھا باندھنا جو بھگت ہونے یعنی التزام ترک گوشت خوری کی علامت ہے۔

(۲) ہندوؤں کے جذبۂ گاؤ پرستی کے لحاظ و خیال کی بنا پر ذبح گاؤ سے پرہیز کرنا اور دوسروں کو بھی اس سے بچنے کی تاکید کرنا یا ہندوؤں کے جبر و دباؤ سے ذبح گاؤ سے احتراز کرنا۔

الجواب

(۱) ان سب امور کو جائز اور بہتر سمجھ کر کرنے والا خارج از اسلام ہے اور مرتد ہے اور اگر بلا اعتقاد جواز ان امور کا کوئی مسلمان مرتکب ہو تو سخت گنہ گار ہے، کیوں یہ سب مراسم مشرکین ہیں۔ ان امور سے بچنا اور پرہیز کرنا مسلمانوں پر واجب ہے۔ (اس کے بعد حدیث و فقہ کے حوالے نقل کیے گئے ہیں)۔

(۲) ان جمیع وجوہ کی بنا پر ذبح گاؤ سے پرہیز کرنا ناجائز ہے۔ ہندو کے خیال سے کہ ان کا دل دکھتا ہے ذبح گاؤ کو ترک کرنا قطعاً حرام ہے، کیوں کہ اس صورت میں تائید علی الشرک ہوتی ہے، اور مشرکین کی ہوا پرستی کی باتوں کو تسلیم کرنا اور ماننا بالکل ناجائز ہے۔ گورکھشا اور گو کے بچانے کا مسئلہ ہندؤں کی ہوا پرستی پر مبنی ہے۔ یعنی گاؤ کے اندر وہ ایک خاص عظمت سمجھ کر قابل پرستش سمجھتے ہیں۔ پس جب تک ہندوؤں کے اندر جذبۂ گاؤ پرستی موجود ہے، اس وقت تک ذبح گاؤ سرزمین ہند میں ایک شعار توحید اور شعار اسلام ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

لئن اتبعت اھواء ھم من بعد ماجاءك من العلم انك اذا لمن الظالمین۔

(یعنی اگر کافروں کی خواہش کے مطابق کام کروگے باوجود اس بات کے تمھیں علم قرآنی حاصل ہو چکا ہے تو بے شک تم اس وقت ظالموں میں سے ہوگے۔)

و نیز مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ مکتوب ہشتاد و یکم جلد اول صـ۱۰۶ مطبوعہ نول کشور لکھنؤ میں تحریر فرماتے ہیں:

غربت اسلام نزدیک بیک قرن بر نہجے قرار یافتہ است کہ اہل کفر بمجرد اجرائے احکام کفر مبر بلاد اسلام راضی نمی شوند۔ می خواہند کہ احکام اسلام بالکلیہ زائل گردد۔ و اثرے از مسلمانان و مسلمانی پیدا نہ شود و کار را تاباں سرحد رسانیدہ اند کہ اگر مسلمانے از شعار اسلام اظہار نماید بقتل می رسد۔ ذبح بقرہ در ہندوستان از اعاظم شعار اسلام است کفار بجزیہ دادن شاید راضی شوند اما بہ تذبیح بقر ہرگز راضی نخواہند شد الی آخرہ۔

(تقریباً ایک قرن سے اسلام کی ایسی حالت ہو گئی ہے کہ کفار اسلامی ممالک پر (مجرد) اپنے کفریہ احکام کے جاری کرنے کے راضی نہیں ہیں، بلکہ احکام اسلامیہ کے بالکل ناپید ہونے کے خواہاں ہیں اور چاہتے ہیں کہ مسلمان اور مسلمانی کا کوئی اثر نہ ظاہر ہو یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ اگر کوئی مسلمان اپنے اسلامی شعار کا اظہار کرے تو کفار اس کو قتل کر ڈالیں گے ہندوستان میں اسلام کی بڑی نشانیوں میں سے ایک بڑی نشانی ذبح گاؤ ہے، کیوں کہ کفار جزیہ دینا شاید منظور کر لیں، مگر گائے کے ذبح کیے جانے پر ہرگز ہرگز رضا مند نہ ہوں گے۔

بکسر کا واقعہ اور گاندھی جی کا دورہ

اس سلسلہ میں مولانا کی زندگی کا ایک تاریخی واقعہ بکسر کا ہے۔ اخباروں میں جب یہ اعلان ہوا کہ ترک ذبح گاؤ کے متعلق چاہے وہ قربانی کی شکل میں ذبح ہو، یا عام طور پر غذا

میں کھانے کے لیے ذبح ہو۔ گاندھی جی، مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے مسلمان لیڈروں کی معیت میں ملک کا دورہ کریں گے اور اس کی تبلیغ کریں گے اور ترغیب دیں گے کہ ہندوؤں کی خاطر مسلمان ذبح گاؤ ترک کر دیں، تو مولانا مضطرب ہو گئے اور نہ معلوم ان کے فکر و تدبر کے عمیق سمندر میں چند منٹ کے اندر کیا تلاطم اٹھا کہ چہرہ تمتما اٹھا، پیشانی پر بل پڑ گیا اور حسب عادت ہونٹوں کو دانتوں کے نیچے دبالیا اور بول اٹھے کہ یہ نہایت ہی خطرناک فتنہ ہے، جس کو پوری قوت سے پہلے ہی قدم پر دبا دینا چاہیے۔

اتنا کہہ کر پھر خاموش ہو گئے، اور پانچ منٹ کے بعد فرمایا کہ بہار کی سرحد پر بہار میں داخل ہونے سے پہلے میں گاندھی جی سے مل کر قربانی گاؤ کے مسئلہ پر گفتگو کروں گا، اگر ان کی سمجھ میں بات آگئی تو خیر، ورنہ میں ان کے جلسہ کے مقابلہ میں ہر جگہ جلسہ کروں گا اور مسلمانوں کو اس فتنہ میں مبتلا ہونے نہیں دوں گا۔

یہاں تک کہ بہار کے دورہ کے لیے جب گاندھی جی بکسر پہنچے تو مولانا یکہ و تنہا ایک دن پہلے سے وہاں موجود تھے۔ مولانا محمد علی اور دوسرے مسلمان لیڈروں سے گفتگو ہوئی۔ مسئلہ کی اہمیت کسی اور صاحب کی سمجھ میں تو نہ آئی مگر مولانا محمد علیؒ سمجھ گئے۔ لیکن انھوں نے مولانا سے فرمایا کہ میں آپ کی ترجمانی گاندھی جی سے کروں گا تو ضرور، لیکن ان کی سمجھ میں آپؒ کی منطق اور آپ کا یہ اصول نہیں آئے گا کہ مباح کے ترک پر جب اصرار کیا جاتا ہے اور اس پر مجبور کیا جاتا ہے تو وہ مستلزم وجوب عمل کو ہو جاتا ہے اور گاندھی جی اس سے مطمئن نہ ہوں گے، گرچہ مسئلہ کے اعتبار سے حق یہی ہے جو آپ فرماتے ہیں۔ لہٰذا کوئی ایسی صاف چیز بتائیے جو میں گاندھی جی کے سامنے رکھوں اور ان کی سمجھ میں بھی آجائے۔

مولانا نے فرمایا کہ ہاں ان کے سامنے اس مسئلہ کو یوں رکھیے کہ ہر اس مسلمان پر جو

چالیس روپیہ یا چالیس روپیہ کی مالیت کی چیز کا مالک ہو اور وہ اس کے حوائج اصلیہ سے زائد ہو، اس پر اسلام میں قربانی واجب ہے۔ اب ہر وہ کسان جو پانچ کٹھہ بھی کھیت رکھتا ہے اس پر قربانی واجب ہے اور ہر وہ عورت جو چالیس روپیہ کا زیور اپنے پاس رکھتی ہے اس پر بھی قربانی واجب ہے۔ اب ایک گھر میں فرض کر لیجیے ایک مرد ہے جس کو پانچ کٹھہ کھیت ہے اور گھر میں چھ عورتیں ہیں (جن کے پاس عموماً اتنی مالیت کی زیور ہوتی ہے) سب پر قربانی واجب ہے اور آئین اسلامی کی رو سے اس کا فریضہ ہے کہ قربانی کرے۔ اب اگر سات راس خصی خریدتا ہے تو فی خصی دس روپیہ کے حساب سے ستر روپے اس کو چاہئیں اور یہ اس کے امکان سے باہر ہے۔ اور اگر ایک گائے خریدنا ہے تو زیادہ سے زیادہ پندرہ روپیہ میں اس کو مل جاتی ہے اور سب کے سب قربانی کے فریضہ سے سبک دوش ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں وہ کیا کرے گا اور اس کے لیے کیا حل ہے

مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ پھڑک اٹھے کہ مولانا بس بس یہ حساب کتاب والی بات گاندھی جی کی سمجھ میں آجائے گی اور میں آپ کی پوری ترجمانی کروں گا۔ چنانچہ حضرت مولانا رح گاندھی جی سے ملے اور مولانا محمد علی رحمہ اللہ نے مولانا کی ترجمانی کی اور تعارف کرایا کہ یہ صوبہ بہار اور اڑیسہ کے نائب امیر شریعت ہیں۔ بالآخر یہ بات طے پاگئی کہ بہار کے دورہ میں ترک ذبح گاؤ پر کہیں تقریر نہیں ہوگی۔ زیادہ سے زیادہ مسلمانوں سے رواداری کی درخواست کی جائے گی اور بس۔

مولانا وہاں سے کامیاب واپس آئے مگر فیصلہ کے باوجود بھی وہ برابر گاندھی جی کے جلسوں کی نگرانی کرتے رہے، اور اس سے باخبر رہے کہ کہاں کہاں کیا کہا جاتا ہے۔

ایک اور واقعہ

اسی سلسلہ کا مولانا کی حرارت ایمانی اور غیرت دینی کا ایک اور واقعہ قابل ذکر ہے کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل کے سلسلہ میں قربانی گاؤ کے متعلق ایک آل انڈیا لیڈر سے خطاب کرتے ہوئے بھری مجلس میں مولانا نے برملا یہ تاریخی الفاظ فرمائے تھے:

سال بھر میں صرف ایک دفعہ گائے کی قربانی سے ڈاکٹر صاحب کا خون کھول جاتا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب کو یاد رکھنا چاہیے کہ ایک مسلمان جب بازاروں میں، دریا کے کنارے اور آبادی میں گذرتا ہے تو ہر قدم پر اس کا خون کھولتا ہے، جب کہ وہ دیکھتا ہے کہ اس کے محبوب خدا کی تحقیر کی جارہی ہے، جس کی وہ پوجا کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ کہیں پتھروں اور مورتیوں کو پوجا جارہا ہے، کہیں دریا کی موجوں کی پوجا ہو رہی ہے، کہیں درختوں کو پوج کر اس کے خدا کے حقوق کو پائمال کیا جارہا ہے۔

لیکن مسلمان ان سب کو اس لیے برداشت کرتا ہے کہ اب تک وہ اس سلوک کا عادی ہے، جو حکمراں ہونے کی حیثیت سے اسے غیر مذاہب کے ساتھ کرنا چاہیے۔ اگر ہندو مطالبہ کرتے ہیں کہ مسلمان گائے کی قربانی ترک کرکے ان کے جذبات کا احترام کریں، تو انھیں غیراللہ کی پرستش چھوڑ کر مسلمانوں کے جذبات کا احترام کرنا پڑے گا۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعہ کو خود مجھ سے بیان فرمایا تھا۔

مولانا کی زندگی کے یہ چند شذرات ہیں جن کو میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں ورنہ مولانا کے سیاسی کارنامے اور دینی اور اجتماعی خدمات، جو امارت شرعیہ اور جمعیۃ علماء کے سلسلہ میں انجام دیئے ہیں اور جن کا میں نے بالقصد کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ سیاسی اور انقلابی

تاریخ کا اتنا بڑا وسیع باب ہے جو اپنے دامن میں دفتر رکھتا ہے۔ اس کا نہ یہ مختصر مضمون متحمل ہو سکتا ہے اور نہ اس مجموعہ میں اس کے لیے گنجائش نکل سکتی ہے۔

خدا حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ کو فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مقتدر کے درجہ عالیہ میں جگہ دے اور ہم لوگوں کو حضرت استاذ کے مشن کو زندہ رکھنے اور چلانے کی توفیق دے۔ آمین۔

محاسنِ ابوالمحاسن

از:- حضرت علامہ سید سلیمان ندوی

مرنا اور جینا دنیا کے روزانہ کاروبار ہیں۔ کون نہیں مرا اور کون نہیں مرے گا، آج وہ کل ہماری باری ہے۔ اس پر بھی عزیزوں اور دوستوں کی ہر موت پر رونے والے روتے ہیں ان کے دائمی فراق پر ماتم اور فریاد کرتے ہیں۔ ان کی ایک ایک خوبیوں کو یاد کرکے ان کا نوحہ پڑھتے ہیں۔ عام حالت یہی ہے۔ لیکن بعض موتیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ ان کی خبر سُن کر زبان بند ہو جاتی ہے، آنسو سوکھ جاتے ہیں، دل کی حرکت بڑھ جانے کے بجائے گھٹ جاتی ہے۔ اندر ہی اندر گھٹن محسوس ہوتی ہے، مگر جی نہیں چاہتا کہ کچھ بول کر دل کی بھڑاس نکالیے اور آنسو بہا کر غم ہلکا کیجیے۔ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد مرحوم کے سانحہ کا مجھ پر بالکل یہی اثر ہوا۔ دن بیت گئے، ہفتے گذر گئے۔ مہینہ پر ایک اور مہینہ گذرا مگر زبان نہ کھلی اور دل کی امانت قلم کے سپرد نہ ہوسکی۔ عزیزوں اور دوستوں کو تعجب ہے کہ میرا قلم جو احباب کی سوگواری میں ہمیشہ اشک ریز رہتا ہے، اس دفعہ اپنے فرض کو کیوں بھولا ہے۔ مگر یہ کیسے بتاؤں کہ اس ناگہانی اور غیر متوقع غم سے مجھے کیوں چپکی لگ گئی۔ ہر چند زبان خاموش تھی لیکن کئی دنوں تک سوتے جاگتے مرحوم کی صورت آنکھوں میں پھرتی اور خواب میں نظر آتی رہی۔ تدمع العین ویحزن القلب ولا نقول الا مایرضی ربنا وانا بفراقک لمحزون۔

اکثر اکابر اور مشاہیر کی ملاقاتیں خاص حالت کی بنا پر یاد رہتی ہیں۔ اور یہ بھی یاد رہتا ہے کہ یہ ملاقاتیں کب ہوئیں، کہاں ہوئیں اور کیسے ہوئیں۔ لیکن اگر محبت کی عمر یاد کی عمر سے زیادہ ہو تو اس کو ازلی ملاقات کہہ سکتے ہیں۔ الارواح جنود مجندة فما ایتلفت منہا ایتلفت وما اختلفت منہا اختلفت۔ اسی اصول کی بنا پر ہے، مجھے یاد نہیں کہ دنیا میں میری ان کی ملاقات کب ہوئی اور کہاں ہوئی اور کیوں کر ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرب مکانی، اتحاد زمانی اور شدت ہم ذوقی کی بنا پر ہم ایک دوسرے سے اتنے قریب تھے کہ پہلی ملاقات میں دید شنید پر کوئی نیا اضافہ نہ کر سکی۔

اس آخری زمانہ میں وہ سال میں ایک دفعہ میرے ایام قیام وطن میں کوئی نہ کوئی کام نکال کر دیسنہ ضرور تشریف لاتے اور میری عزت بڑھاتے اور ان کے ملنے والوں میں کون تھا جس کی عزت اپنی محبت سے وہ نہ بڑھاتے۔ ان کی تواضع میں بلندی، سادگی میں بناؤ اور خاموشی میں گویائی تھی۔ وہ اکیلے تھے لیکن لشکر تھے، پیادہ تھے مگر برق رفتار تھے، وہ قال نہ تھے سراپا حال تھے، کہتے کم کرتے زیادہ تھے۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ "راہ" اور "منزل" کے فرق کو کبھی فراموش نہ کیا، انھوں نے راہ میں ہمراہیوں کے لطف کلام میں پھنس کر منزل سے ہٹنا کبھی گوارہ نہیں کیا، وہ وطن کی آزادی اور احکام مذہبی کی پیروی کے درمیان التباس اور تصادم سے کبھی بے خبر نہیں رہے۔ جذبہ آزادی کی پوری قوت کے باوجود انھوں نے کانگریس یا کانگریسی حکومت کے غلط قدم اٹھانے پر کبھی بزدلانہ یا صلح پسندانہ درگزر سے کام نہیں لیا۔

مرحوم کی زندگی کے سوانح لکھنے والے لکھیں گے، مگر عقیدت کی چند سطریں اُن کے ایک دیرینہ نیاز مند کی طرف سے یادگار اوراق رہیں تو محسن کے شکریہ کا بار اس کے کندھے سے کم ہو۔

وطن صوبۂ بہار میں قصبۂ بہار اور گیا کے درمیان کا علاقہ ہندوؤں کے عہد میں بودھوں اور جینیوں کی یادگاروں سے بھرا ہوا ہے۔ اسی راستہ میں چند میل آگے بڑھ کر بودھوں کی مشہور درسگاہ نالندہ کے آثار اور کھنڈر ہیں۔ اسی سے ملا ہوا پنہسا نام مسلمانوں کا ایک گاؤں ہے، جہاں سادات کے کچھ گھرانے آباد ہیں۔ انھیں میں سے ایک گھر میں مولانا سجادؒ کی ولادت ہوئی۔

تعلیم و تربیت تیرہویں صدی کے شروع میں صوبۂ بہار میں مولانا وحید الحق صاحب استھانوی بہاری کے دم قدم سے علم کو نئی رونق حاصل ہوئی۔ قصبۂ بہار میں انھوں مدرسہ اسلامیہ کی بنیاد ڈالی اور بہت سے عزیزوں کی تربیت کی، ان میں سے ایک مولانا سجادؒ بھی تھے۔ عربی کی ابتدائی تعلیم ان ہی کے زیر سایہ ہوئی، اور ان کی پہلی شادی بھی اُن ہی کی دختر نیک اختر سے ہوئی تھی۔

آخری تعلیم الٰہ آباد کے مدرسہ سبحانیہ میں مولانا عبدالکافی صاحب الٰہ آبادی کی درسگاہ میں ہوئی، اور وہیں ۱۳۱۷ھ سے ۱۳۲۲ھ تک رہ کر سند فراغ حاصل کیا۔

ابتدائی کام تعلیم سے فارغ ہو کر مدرسی کی خدمت انجام دی۔ اس عرصہ میں کبھی وہ مدرسہ اسلامیہ بہار میں رہے اور کبھی مدرسہ سبحانیہ الٰہ آباد میں، ۱۳۲۹ھ تک یعنی سات برس تک وہ اس فرض کو انجام دیتے رہے، ۱۳۲۹ھ میں مدرسہ انوار العلوم کی بنیاد ڈالی۔ مولانا عبدالوہابؒ[1] منطقی بہاری بھی شریک کار تھے، یہ بات مجھے یوں یاد رہی کہ شاید

---

[1] مولانا عبدالوہاب صاحب نے جس انوار العلوم کی بنیاد ڈالی تھی وہ ختم ہو کر بالکل تمام ہو چکی تھی انوار العلوم کی اس بنیاد جدید میں مولانا عبدالوہاب صاحب شریک کار نہ تھے،

سنہ ۱۹۰۸ءیا سنہ ۱۹۰۹ء تھا کہ مدرسہ مذکور کے ایک جلسہ سالانہ میں مولانا عبدالوہاب صاحب کی دعوت پر مولانا شبلی نعمانی مرحوم اور مولانا عبدالحق صاحب حقانی دہلوی مرحوم شریک جلسہ ہوئے تھے اور تقریریں کی تھیں۔

مولانا سجاد صاحب رح مدرسہ انوارالعلوم کا یہ جلسہ سال بہ سال کیا کرتے تھے اور اس میں علماء کو بلاتے تھے اور ان سے تقریریں کراتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اکثر علماء سے ملاقاتوں کا آغاز ان ہی جلسوں میں ہوا۔ مجھے بھی ایک دو دفعہ ان جلسوں میں حاضری کا اتفاق ہوا۔

سیاسیات کا ذوق

ان کو سیاسیات کا ذوق جنگ عظیم میں ترکی کی شکست اور ممالک اسلامیہ کی پراگندگی سے ہوا۔ وہ اس وقت الٰہ آباد میں تھے، ان کے ایک انگریزی داں شاگرد ان سے عربی پڑھنے آتے تھے، وہ اپنے ساتھ اردو اور انگریزی اخبارات لاتے تھے اور مولانا سجاد رح کو پڑھ پڑھ کر سناتے تھے۔ یہ آگ روز بہ روز بھڑکتی چلی گئی۔ مولانا ابوالکلام کے الہلال کی تحریک نے بنگال کے قرب کے سبب سے بہار پر پورا اثر کیا تھا اور بہت سے علماء نے ان کی اس تحریک پر لبیک کہا۔ ان میں سے مولانا سجاد رح کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔

رانچی کی اسیری کے زمانہ میں مولانا ابوالکلام نے ہم خیال اور کارفرما علماء کی تلاش کا کام ایک مخلص کے سپرد کیا تھا، انھوں نے جن علماء کا نشان دیا ان میں سے ایک مولانا سجادؒ بھی تھے جو اس وقت انوارالعلوم گیا کی مسند درس پر تھے۔

سنہ ۱۹۱۹ء کی تحریک خلافت کی ترقی کے ساتھ ساتھ مولانا کا ذوق سیاست بھی بڑھتا گیا۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی کی تحریک اور مسیح الملک حکیم

اجمل خاں مرحوم کی تائید سے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی صدارتؒ میں جب جمعیۃ العلماء دہلی کی بنیاد پڑی تو موصوف اس کے لبیک کہنے والوں میں سب سے اول تھے، اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کتنے رفیق سفر تھک تھک کر اپنی جگہ پر بیٹھ رہے تھے، مگر ان ہی کی ایک ہستی تھی جو آخر تک جمعیۃ کے ساتھ لگی رہی، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ انھیں کی روح تھی جو اس کے قالب میں جلوہ گر ہوتی رہی۔

بہار میں امارت شرعیہ کا قیام ان کی سب سے بڑی کرامت ہے۔ زمین شور میں سنبل پیدا کرنا اور بنجر علاقہ میں لہلہاتی کھیتی کھڑی کر لینا ہر ایک کا کام نہیں۔

سنہ ۱۹۱۸ء میں معارف میں اس تحریک کو اٹھایا گیا اور اصلاحات کے سلسلہ میں اس کو پیش کیا گیا۔ پھر یورپ سے واپسی کے بعد چاہا کہ اس کو ہندوستان کا مسئلہ بنایا جائے، مگر اس عہد کے جدید تعلیم یافتہ علم برداروں نے اس کو چلنے نہ دیا۔ بہار میں مولانا ابوالکلام صاحب کی تحریک پر مولانا سجاد صاحبؒ کی قوت عمل نے اس کو وجود کا قالب بخش دیا۔

مولانا سجاد مرحوم کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ علماء سیاسیات میں بھی قوم کی رہبری کا فرض انجام دیں، مسلمانوں میں دینی تنظیم قائم ہو جائے جس کے تحت میں ان کے تمام تبلیغی، مذہبی اور تعلیمی و تمدنی کام انجام پائیں۔ دار القضاء قائم ہو کر مسلمانوں کے ہر قسم کے

لہ سنہ ۱۹۲۰ء میں حضرت شیخ الہند کی زیر صدارت جمعیۃ علماء کا دوسرا اجلاس تھا۔ جمعیۃ علماء ہند کا پہلا اجلاس سنہ ۱۹۱۹ء میں بمقام امرتسر زیر صدارت مولانا عبدالباری صاحب رحمۃ اللہ علیہ منعقد ہوا تھا۔

(عبدالصمد رحمانی)

مقدمات و معاملات تصفیہ پائیں۔ مسلمانوں کا بیت المال قائم ہو جہاں مسلمانوں کے صدقات و مبرّات و زکوٰۃ کی ساری رقمیں اکٹھی ہو کر ضروریات میں خرچ ہوں اور مستحقین میں تقسیم ہوں۔ مولانا رحمہ نے عمر کے آخر بیس برس ان ہی کاموں میں صرف کیے اور حق یہ ہے کہ انھوں نے ہر قسم کی مالی بے بضاعتی، مددگاروں کی کمی، رفقاء کی ناسپاسی اور حالات کی مخالفت کے باوجود جو کچھ کر دکھایا وہ ان کی حیرت انگیز قوت عمل کا ثبوت ہے اور اللہ تعالیٰ کی توفیق خاص ہے۔

بہار کی تنہا دولت

ان کا وجود گو سارے ملک کے لیے پیام رحمت تھا، مگر حقیقت یہ ہے کہ صوبۂ بہار کی تنہا دولت وہی تھے۔ اس صوبے میں جو کچھ تبلیغی، تنظیمی، سیاسی اور مذہبی تحریکات کی چہل پہل تھی وہ کل ان ہی کی ذات سے تھی، وہی ایک چراغ تھا جس سے سارا گھر روشن تھا، وہ وطن کی جان اور بہار کی روح تھے۔ وہ کیا مرے کہ بہار مر گیا۔ مرثیہ ہے ایک کا اور نوحہ ساری قوم کا۔

علم و فضل

فلسفۂ تاریخ کے ماہر کہتے ہیں کہ علم اور عمل کم یکجا ہوتے ہیں۔ لیکن ان کمیاب مثالوں میں مولانا سجادؒ کی ذات تھی۔ وہ اپنے وقت کے بڑے مشاق مدرس اور جامع العلم عالم تھے۔ خصوصیت کے ساتھ معقولات اور فقہ پر ان کی نظر بہت وسیع تھی جزئیات فقہ اور خصوصاً ان کا وہ حصہ جو معاملات سے متعلق ہے نظر میں تھا۔ امارت شرعیہ کے تعلق سے اقتصادی و مالی و سیاسی مسائل پر ان کو عبور کامل تھا۔ زکوٰۃ و خراج و قضا، و امامت و ولایت کے مسائل کی پوری تحقیق فرمائی تھی۔ ہر چند کہ سالہا سال سے درس و تدریس و مطالعہ کا اتفاق نہیں ہوا تھا مگر جب گفتگو کی گئی ان کا علم تازہ نظر آیا۔

ان کا علم محض کتابی نہ تھا بلکہ آفاقی بھی تھا، معاملات کو خوب سمجھتے تھے۔ ان کو بارہا بڑے

معاملات اور مقدمات میں ثالث بنتے ہوئے دیکھا ہے اور تعجب ہے کہ کیوں کر فریقین کو وہ اپنے فیصلہ پر راضی کر لیتے تھے اور اسی لیے لوگ اپنے بڑے بڑے کام بے تکلف ان کے ہاتھ میں دے دیتے تھے۔ کیوں کہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا حصہ فکر رسا اور رائے صائب تھی، مسائل و حوادث میں ان کی نظر بہت دور تک پہنچ جاتی تھی، وہ ہر گتھی کو نہایت آسانی سے سلجھا دیتے تھے، حریف کی چالوں کی تہ تک پہنچ جاتے تھے، باوجود تواضع و خاکساری کے اپنی رائے پر پوری قوت کے ساتھ جمے رہتے تھے اور ہٹ اور ضد سے نہیں بلکہ دلائل کی قوت اور مصالح کی طاقت سے وہ دوسروں کو منوانے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔

اخلاق

وہ بے حد خاکسار اور متواضع تھے۔ کبھی کوئی اچھا کپڑا انھوں نے نہیں پہنا کبھی کوئی قیمتی چیز ان کے پاس نہیں دیکھی۔ کھدر کا صافہ، کھدر کا لمبا کرتا، کھدر کی صدری، پاؤں میں معمولی دیسی جوتے اور ہاتھ میں ایک لمبا عصا۔ یہ ان کی وضع تھی، مگر وہ اپنی سادہ اور معمولی وضع کے ساتھ بڑے بڑے جلسوں اور بڑے بڑے مجمعوں میں بے تکلف جاتے تھے اور اپنا لوہا منواتے تھے۔ جوہر پہچاننے والے بھی تلوار کی کاٹ دیکھتے تھے، غلاف کی خوبصورتی نہیں۔

ہر شخص کی مصیبت میں ہر وقت کام آتے تھے اور ہر ایک کی سفارش میں ہر وقت سینہ سپر ہو جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو جاہ و مرتبہ بھی عطا فرمایا، انھوں نے اپنی پارٹی کی وزارت بھی بنائی اور بادشاہ گر نہیں تو وزیر گر بنے۔ کانگریسی حکومت کے دور میں بھی ان کو اچھا اقتدار حاصل رہا، مگر خدا گواہ کہ وہ اس اثر و اقتدار کو اپنی ذات کے لیے کبھی کام میں نہیں لائے جو کچھ کیا وہ مسلمانوں کے لیے۔

ان کی زندگی نہایت سادہ تھی، غربت اور عسرت کی زندگی تھی۔ گھر کے خوشحال نہ تھے،

امارت سے معاوضہ بہت قلیل لیتے تھے۔ سفر معمولی سواریوں اور معمولی درجوں میں کرتے تھے، اور اسی حال میں پورب سے پچھم اور پچھم سے پورب، اور اتر سے دکھن اور دکھن سے اتر دوڑتے رہتے تھے۔ ان کا دن کہیں گزرتا تھا اور رات کہیں۔ مسلمانوں کی سلامتی و تنظیم کی ایک دھن تھی کہ ان کو دن رات چکر میں رکھتی تھی، کہیں قربانی کا جھگڑا ہو، مسلمانوں پر مقدمہ ہو، کہیں سیلاب آئے، کہیں آگ لگے، کہیں ہندو مسلم تنازعہ ہو، وہ ہر جگہ خود ہی جاتے تھے، معاملہ کا پتہ لگاتے تھے، مظلوموں کی مدد کرتے تھے، ان کے لیے چندہ کرتے تھے، جہاں سے ہوسکتا تھا وہ ان کو لاکر دیتے تھے اور خود خالی ہاتھ رہتے تھے۔

بہار میں زلزلہ کے زمانہ میں انھوں نے جس تندہی سے کام کیا اور ایک ایک گاؤں جاکر جس طرح بے گھروں کو اور بے خانماؤں کو مدد دی، وہ ان کی زندگی کا بڑا کارنامہ ہے جس کا صلہ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی بارگاہ سے ان کو عنایت فرمایا ہوگا۔

لیڈروں اور قومی کارکنوں کے پاس عام طور سے ان کے اثر کے ذریعے تین ہیں، دولت ہے یا حسن تقریر ہے یا زور قلم ہے۔ مرحوم ان تینوں دولت سے محروم تھے۔ وہ غریب تھے اور غریبوں ہی میں زندگی بسر کی، زبان میں لکنت تھی جس کے سبب سے وہ بولنے پر قادر نہ تھے اور اسی لیے وہ تقریر بہت کم کرتے تھے، اور ان کے قلم میں وہ زور بھی نہ تھا جو آجکل کی انشا پردازی کا کمال ہے، تاہم ان سب کا بدل ان کے پاس ان کا ایک اخلاص تھا جو اس کی کمی کو پورا کردیتا تھا۔ عجیب نہیں کہ زبان و قلم کا عجز ہی تھا جو ان کی قوتِ عمل کی صورت میں ظاہر ہوا۔

جمعیۃ العلماء کے اجلاس کلکتہ کے خطبہ میں ان کی نسبت یہ الفاظ نکلے تھے جو پہلے مدح تھی، اب مرثیہ ہے:

"۱۳۴۳ھ کے اجلاس خاص مراد آباد کے موقع پر بھی مجھے یہ عزت عطا
ہوئی تھی مگر عین وقت پر وفد حجدہ کی شرکت نے انکار پر مجبور کیا۔ اور میں خوش
ہوں کہ اسی کی بدولت ایک خاموش ہستی بولی اور ایک بے زبان نے
زبان کے جوہر دکھائے اور ایک ہمہ تن سوز و گداز نے کاغذ کے صفحوں پہ اپنے
دل کے ٹکڑے بکھیرے۔"

یہ بھی مولانا رح ہی کی قوت جاذبہ تھی جو مختلف الخیال علماء اور مختلف الرائے سیاسی
رہنماؤں اور قومی کارکنوں کو ایک ساتھ ایک پلیٹ فارم پر جمع کیے اور ایک شیرازہ میں
باندھے ہوئے تھی ۔

شاید یہ کم لوگوں کو علم ہو کہ مولانا رح کی خانگی زندگی غمگین تھی، ان کے بڑے بھائی مجذوب
تھے، ان کی بیوی معذور و مختل تھیں، ان کا بڑا لڑکا جو پڑھ کر فاضل اور گھر کا کام سنبھالنے کے قابل
ہوا، عین اسی وقت کہ اس کے نکاح میں چند روز باقی تھے، باپ نے دائمی جدائی کا داغ
اٹھایا اور یہ سننے کے قابل ہے کہ وہ لڑکا مرض الموت میں تھا کہ مسلمانوں کی ایک ضرورت ایسی
سامنے آئی کہ باپ بیمار بیٹے کو چھوڑ کر سفر پر روانہ ہو گیا۔ واپس آیا تو جوان بیٹا دم توڑ رہا تھا۔

ان کی اپنی زندگی بھی دین و ملت ہی کے نذر ہوئی۔ ترہت کے دور افتادہ علاقہ
میں جہاں کہ ملیریا کے ڈر سے اِدھر کے لوگ اُدھر جانا موت کے منہ میں جانا سمجھتے ہیں، یہ مردِ خدا
اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر سال میں کئی کئی بار جاتا تھا اور کئی کئی دن وہاں رہتا تھا۔ آخری سفر
بھی وہیں ہوا اور وہیں سے ملیریا کی سخت بیماری اپنے ساتھ لایا اور اسی حال میں جان
جاں آفریں کے سپرد کی۔

جانے والے تیری روح کو سلام! جب تو زندہ تھا تو تیری قوم نے تیری

قدر نہ پہچانی! اب تو عالم ابد میں ہے۔ میرے کان غیب سے تیری زبان مجاز سے یہ آواز سنتے ہیں:

يٰلَيْتَ قَوْمِىْ يَعْلَمُوْنَ بِمَا غَفَرَلِىْ رَبِّىْ وَجَعَلَنِىْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ۔ (یٰسٓ)

اے کاش کہ میری قوم جانتی کہ خدا نے مجھے بخشا اور مجھے ان میں داخل کیا جن پر ان کا کرم ہوا۔

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ

(مختصر تعلیمی و سیاسی زندگی)

از:- مولانا محمد اصغر حسین صاحب بہاریؒ نائب پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ
(پٹنہ)

دائرہ شاہ اجمل الٰہ آباد میں مولوی عبدالحمید جون پوری کی کوٹھی ہے جس کے ایک گوشہ میں چھپر کا ایک سائبان ہے، اس میں چند طلبہ کے ساتھ حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ قیام پذیر ہیں۔ اور درس نظامی کی انتہائی کتابوں کی تحصیل میں حضرت مولانا حافظ عبدالکافی قدس سرہٗ اور مولوی عبدالحمید جون پوری مرحوم کو دلیل راہ بنائے ہوئے ہیں۔ حضرت ابوالمحاسنؒ کے ساتھ دو تین بزرگ اور بھی شریک درس ہیں لیکن مولانا رح کی شان نرالی ہے بستر کے سرہانے کروٹ میں کتابیں قطار در قطار رکھی ہیں، جن کے مطالعہ میں انہماک ہے یا بعض طلبہ کے درس دینے سے سروکار ہے۔ حافظ عبدالکافی قدس سرہٗ نے چوک الٰہ آباد کی مسجد کے احاطہ میں مدرسہ سبحانیہ قائم کر رکھا ہے، جس میں عموماً طلبہ پڑھتے ہیں لیکن حضرت سجادؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کے شوق میں کم از کم ایک سبق بھی ضرور رکھنا چاہتے ہیں، اور جنھیں موقع ملا پڑھ رہے ہیں۔ اس کشش سے ظاہر ہے کہ طلب علم ہی کے زمانہ سے آپ کی تعلیم میں مقناطیسی اثر تھا۔ ادھر اساتذہ کی عنایات و توجہات سے عیاں ہو رہا تھا کہ ان حضرات کے لیے

حضرت سجادؒ کی شاگردی ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ان بزرگوں کی خالص توجہ اور قدردانی بالکل بجا تھی۔ گو اس وقت یہ معلوم نہ تھا کہ شمع طالب سے نور پھیلنے کے علاوہ اس کے ناخنِ فکر و تدبیر سے سیاسی و اجتماعی عقدوں کا بھی حل ہونے والا ہے اور اسلامی ہند کے مفکر اعظم ہونے کی حیثیت سے مذہبی سیاست کی گتھیوں کے ایک ایک تار کو سلجھا کر رکھ دینے والا ہے، لیکن ذہانت، فطانت، قوت حافظہ، شوقِ مطالعہ، سلامت روی، سادگی، محنت اور اطاعت شعاری جو جو صفتیں جاذبِ توجہ ہو سکتی ہیں حضرت سجادرح میں بدرجہ کمال موجود تھیں۔ اس لیے ان کی عنایات و توجہات کا منعطف ہونا ناگزیر تھا۔

اِس ہنگام طالب علمی کے شاگردوں میں مولانا فرخند علی مرحوم سہسرامی کی ذات بابرکات تھی، جن کے علم و عمل کا فیض مدرسہ خیریہ سہسرام کی شکل میں اب بھی جاری ہے اور جو عمر بھر سیاسیات میں اپنے استاذ محترم حضرت مفکر اعظم رح کے دست و بازو رہے اور اسی دَور کے تلامذہ میں سے محبّی مولانا حافظ عبدالرحمن بادشاہ پوری جونپوری (فی الحال مدرس اوّل مدرسہ امدادیہ دربھنگہ) اور جناب حکیم مولوی محمد یعقوب صاحب ساکن کڑا (گیا) بھی ہیں۔

میں بھی اسی اثناء میں قطبی وغیرہ پڑھتا ہوا تعلیمی غرض سے الٰہ آباد پہنچا تھا اور شریکِ درس ہونے والا تھا لیکن بعض اسباب کی بنا پر مجھے اپنے وطن بہار شریف واپس ہونا پڑا اور اس وقت حلقۂ درس میں داخل نہ ہو سکا۔ غالباً یہ ۱۹۰۲ء ۱۳۲۰ھ کا واقعہ ہے۔

جب حضرت مولانا رح فارغ ہو کر پٹنہ اپنے دولت خانہ تشریف فرما ہوئے تو مدرسہ اسلامیہ بہار شریف کے ناظم حافظ وحید الحق مرحوم اور مدرس اوّل جناب خان بہادر مولانا مبارک کریم صاحب مدظلہٗ نے مدرسہ موصوف میں درس دینے کے لیے ان خصوصیات کی بنا پر جو حضرت موصوف رح کو مدرسہ سے تھیں، زور دیا۔

حضرت کی ابتدائی تعلیم اسی مدرسہ میں ہوئی تھی اور حضرت جامع کمالات مولانا سید وحید الحق استھانوی رحمۃ اللہ علیہ بانی مدرسہ کے خاص رشتہ دار[1] ہونے کے علاوہ چھوٹے داماد بھی تھے۔ وقت و مقام کے لحاظ سے درس و تدریس کے دلی جذبات کے اظہار کا موقع مدرسہ اسلامیہ سے کوئی بہتر نہ تھا۔ اہل جوار کی علمی خدمت کے ساتھ اپنے مخلص بزرگ کے شجرِ علم کی آبیاری اور قربِ مکان کی وجہ سے خانگی ضروریات کی نگرانی میں آسانی مقصود تھی۔ غرض یہ کہ دونوں بزرگوں کی خواہش پر مدرسہ اسلامیہ تشریف لے آئے اور درس جاری فرما دیا۔ مزاج کی نرمی، عفو و درگذر کی طینت اور طلبہ کی ہمدردی کے ساتھ جو اپنی طباعی اور انہماک شان سے شب و روز درس و تدریس کی مہم شروع کی تو تھوڑے ہی عرصہ میں مدرسہ کے تعلیمی قالب میں نئی روح پھونک دی۔ ایک مدت سے مدرسہ قائم تھا لیکن شرح وقایہ، جلالین شریف، قطبی میر قطبی وغیرہ سے اوپر پڑھنے والے طلبہ کبھی نہ رہے، جہاں ملا حسن وغیرہ پڑھنے کی نوبت آئی اور یوپی کی راہ لی۔ مگر حضرت ابو المحاسنؒ کے پُر محبت درس نے ایسی سحر کاری کی کہ اب طلبہ مدرسہ میں جمنے لگے۔ چنانچہ میں بھی میر زاہد رسالہ اور ترمذی شریف تک پہونچ گیا۔

ہر اسلامی مدرسہ کے دستور کے مطابق اس مدرسہ میں بھی سالانہ تقریری امتحان شہر کے خاص خاص علماء لیتے تھے۔ لیکن حضرت مفکر اعظمؒ نے اس سلسلہ میں عامہ مسلمین کی توجہ مدرسہ کی طرف منعطف کرانے کے لیے ایک خاص تدبیر کی بنیاد ڈالی۔ مدرس اول و ناظم مدرسہ کے مشورہ سے سالانہ امتحان کے موقع پر ممتحنین کے علاوہ دیگر حضرات اہل علم و فضل اور عام خلائق کو بھی دعوت دینی شروع کی اور امتحانات کے مناظر کا مشاہدہ کرانے کے ساتھ

---

[1] حضرت مولانا وحید الحق کی اہلیہ مولانا مرحوم کی چچازاد بہن تھیں۔ (م۔ع)

ان کی دل چسپی و کشش کے لیے چاتے بسکٹ سے تواضع کا سلسلہ شروع کیا جس کی وجہ سے ایک ڈو روز مدرسہ میں خاصی چہل پہل ہوتے لگی۔ ممتحن و طلبہ کے گرد اگرد دوسرے حضرات اہل علم امتحان کی کیفیت کا تماشہ کرنے کو بیٹھ جاتے تو اس وقت تعلیمی نمائش کا قابل دید منظر ہوتا تھا۔ مولانا محمد حسن استھانوی غفرلہ تلمیذ مولانا ہدایت اللہ خاں صاحب مرحوم کسی زمانہ میں مدرسہ اسلامیہ کے مدرس اول رہ چکے تھے امتحان کے لیے تشریف لائے اور میر زاہد رسالہ مع حاشیہ غلام یحییٰ بہاری کے امتحان کے سلسلہ میں میں اور مولانا حافظ عبدالرحمٰن[1] جونپوری پیش کیے گئے تو انھوں نے فرمایا کہ آج ایک عجیب منظر دیکھنے میں آرہا ہے کہ بہار شریف میں ان کتابوں کے پڑھنے والے طلبہ موجود ہیں۔ پھر انھوں نے اپنی منطقیانہ شان سے امتحان لینے کے دوران میں سوالات شروع کیے اور ہم دونوں جوابات دینے لگے تو اس دن کے اس منظر کی لذت آج بھی اہل علم بزرگوں کے کام و دہن میں باقی ہے۔ مولانا سید شاہ محمد اسمٰعیل[2] غفرلہ (مدرس فقہ مدرسہ عالیہ کلکتہ) سے جب ملنے کا اتفاق ہوتا تو اس امتحانی مظاہرہ کا تذکرہ مزہ لے لے کر فرمایا کرتے تھے۔ پھر اتنی تعلیمی ترقی ہوئی کہ درس نظامی سے پوری فراغت اس مدرسہ میں ہونے لگی۔ مگر میں خانگی وجوہ کی بنا پر مولانا رحہ سے الگ ہو کر الٰہ آباد مدرسہ سبحانیہ چلا گیا اور یہاں ایک سال رہ کر مدرسہ احیاء العلوم الٰہ آباد میں مولانا منیر الدین ناروی الٰہ آبادی غفرلہ تلمیذ رشید حضرت مولانا احمد حسن کانپوری رحہ کے حلقۂ درس میں داخل ہو گیا۔ اس عرصہ میں مدرسہ اسلامیہ بہار شریف کے کچھ طلبہ فارغ ہو گئے جن کی دستار بندی کے جلسہ میں شرکت کے لیے دیگر علماء کرام کے علاوہ استاذ محترم مولانا منیر الدین غفرلہ کو بھی تکلیف دی گئی اور

---

[1] مولانا عبدالرحمٰن جونپوری آج کل قدیم طرز کے معقولی علماء میں خاص امتیازی حیثیت کے مالک ہیں۔ (م۔ع)

[2] مولانا سید شاہ محمد اسمٰعیل صاحب بہار شریف (پٹنہ) کے ایک ممتاز عالم اور دیندار بزرگ تھے، چند سال ہوئے کہ وفات پائی۔ (م۔ع)

حضرت مفکر اعظم رح کی تجویز و تحریک سے مجھ کو بھی استاذ مکرم مولانا منیر الدین الہ آبادی کے خادم کی حیثیت سے بلایا گیا چنانچہ میں بھی استاذ رح کے ساتھ اس جلسۂ دستار بندی میں شریک ہوا۔ بہار شریف میں مدرسہ قائم ہونے کے مدتوں بعد یہ پہلا زریں موقع تھا جس میں درس نظامی کے فارغین کو سند تکمیل عطا ہوئی اور بیضاوی شریف میں امتحان لیے جانے کے بعد ان کے سروں پر دستار فضیلت باندھا گیا۔ اس جلسہ میں عمائدین شہر اور عوام بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوئے۔ یہ حضرت سجاد رح ہی کی محنت و کاوش و حسن تعلیم کا نتیجہ تھا جو بہاری طلبہ کے دماغوں سے خواہ مخواہ یوپی جانے کی ہوس دور ہوئی۔ ورنہ بہاریوں میں اب تک بیرون بہار کی بڑی مانگ ہے۔ خصوصاً عربی پڑھنے والے بغیر کانپور، دہلی وغیرہ سے فراغت کیے ہوئے علمائے معتبر کی صف میں جگہ نہیں پاتے، ایسی صورت میں طلبۂ عربی کو فراغت تک پہنچانا، یہ حضرت سجاد رح کی کرامت تھی۔

درس و تدریس میں جن امور کی رعایت سے طلبہ کو پوری تشفی ہو سکتی ہے، مولانا رح اس میں کسی طرح کی کمی جائز نہ رکھتے۔ مطالب کتاب کو خوب کھول کر سامنے رکھنے کی سعی فرماتے ظاہر ہے کہ اس کے لیے کس قدر گہرے مطالعہ اور توسیع معلومات کی محنت برداشت کرنے کی ضرورت ہے۔ پھر ایک بار کی تقریر سے تشفی نہ ہوتی ہو تو دوبارہ سہ بارہ تقریر کرنے میں چیں بہ جبیں نہ ہوتے اور اگر اوقات مدرسہ میں آسودگی نہ ہوتی تو خارج وقت دینے میں کوئی دریغ نہ فرماتے۔ حتیٰ کہ شروح و حواشی دکھلا کر تشفی فرمانے کی زحمت گوارہ کرتے، بلکہ کتاب کے مشکل مقامات کو اہل فضل کے سامنے رکھ کر تشفی کرانے میں بھی بے نفسی کو ثبوت دیتے۔ پھر طلبہ کے اسباق کا اس قدر احساس تھا کہ شہر کی آب و ہوا کی روایت کے باعث مدرسہ ہفتہ دو ہفتہ کے لیے بند ہو جاتا تو پندرہ بیس طلبہ کو بنفسہ اپنے مکان لیے جاتے اور سب کے ناشتے کھانے

کے خود کفیل ہو کر مکان ہی پر درس میں مشغول ہوتے۔ مجھ کو بھی ایک مرتبہ ایسا موقع ملا ہے، اس وقت مولانا رح کے یہاں خوب کاشت کاری ہوتی تھی۔ کھانے پینے میں بڑی وسعت تھی، خدام وحشم سب ہی کچھ تھے، لیکن آپ نے درس وتدریس کے شوق میں اس طرف سے توجہ ہٹالی اور آپ کے بڑے بھائی مولوی احمد سجاد صاحب بھی مجذوبانہ کیفیت سے متکیف ہوکر الگ ہوگئے، نوکروں پر مدار رہ گیا اس واسطے کاشت کاری کی حالت زبوں ہوگئی بہرحال حضرت مولانا کی سعی اور محنت وقربانی کا جو نتیجہ ہونا چاہیے ہو کر رہا۔ ایک طرف تو طلبہ گرویدہ ہوکر آپ ہی کے ہو رہے اور دوسری طرف خود حضرت مفکر اعظم رح تحقیقات ومعلومات کے بحر ذخار ہوگئے۔ جس نے دیکھا ہے کہ حافظ صاحب الٰہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیم وتدریس محض ایک تبرک کی حیثیت رکھتی تھی تو اس کے لیے مولانا رح کی اس علمی ترقی میں حیرت کی اور بھی کوئی حد نہیں رہتی، چنانچہ میں نے اپنے اس تحیر کو عرض بھی کیا، فرمایا کہ "نہیں" وہاں بھی روشنی ملتی ہے۔ علاوہ اس کے میں ایک گونہ صلاحیت پیدا کرکے پہنچا تھا۔

مولانا عبدالشکور صاحب مظفر پوری (فی الحال مدرس مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ) سے سلم وغیرہ کتاب پڑھ کر کتاب فہمی کی صلاحیت پیدا ہوگئی تھی۔ حضرت مفکر اعظم رح تہذیب وغیرہ پڑھنے کے زمانے میں کانپور سے دیوبند تشریف لے گئے تھے، لیکن ایک مفتی سے لڑائی ہونے کے قصہ میں بہاری طلبہ کو جس کے سرخیل مولانا محمد عبدالشکور صاحب تھے، دیوبند کو خیرباد کہنا پڑا۔ مگر حضرت سجاد رح کو دیوبند کی یاد تازہ رہی۔ اکثر دیوبند کا ذکر فرمایا کرتے۔ اسی قلبی تاثرات نے سیاسیات کے سلسلہ میں دیوبند یوں سے ایسا ملایا کہ ایک فرد متصور کیے جانے لگے اور اکابر علمائے دیوبند نے بھی آپ کے تبحر علمی کے ساتھ ایثار وقربانی، استقلال وفکری جدوجہد کی قدردانی کرتے ہوئے اپنے مشن کا وزیر بنا لیا بلکہ حقیقت میں جزو کل مان لیا۔ آپ ہی کے بار بار تذکرۂ دیوبند نے

میرے دل میں تحریک پیدا کر دی جو مدرسہ اسلامیہ بہار شریف کے جلسہ دستار بندی کی شرکت کے بعد عملی جامہ پہن سکی۔ شوال ۱۳۲۶ھ میں الٰہ آباد ہوتا ہوا بمعیت محبی جناب حافظ عبدالرحمٰن صاحب بہاری (مدرس مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ) دیوبند پہنچا اور حضرت مولانا رح بھی مدرسہ سبحانیہ الٰہ آباد تشریف لے گئے، پھر وہاں سے گیا تشریف لا کر مدرسہ انوار العلوم کو زندہ کیا اور اپنے فکر و عمل سے مدرسہ کو خوب ترقی دی۔ دستار بندی کے متعدد جلسے دھوم دھام سے کرتے رہے اور ہندوستان کے مشہور علماء، مقررین و واعظین کو بلا کر تبلیغ کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ان مشغولیتوں کے باوجود مدرسہ اسلامیہ بہار شریف سے برابر تعلق قائم رہا اور قدیم ہمدردی میں کمی واقع نہ ہوئی۔ مدرسہ کا سالانہ جلسہ خصوصاً آپ کی قائم کردہ سنت کے موافق فارغین کی دستار بندی کا جلسہ جو ہوتا تھا اس موقع میں آپ تشریف لا کر جلسہ کو پُر رونق بنانے کی پوری سعی فرماتے۔ مدرسہ کے ناظم و مدرس اول بھی ان مواقع میں آپ کی شرکت کو ضروری سمجھتے۔ جلسہ کی تاریخ سے بہت پیشتر خط و کتابت کر کے وعدہ لے لیتے۔ غرض طرفین میں باہم خلوص و اعتماد تھا۔ اور مدرسہ کی ترقی و بہبودی پیش نظر رہی۔ میں ڈو برس کے قریب دیوبند رہ کر واپس آیا، اور مدرسہ اسلامیہ میں مدرس ہو گیا۔ حضرت مولانا رح کی مجھ پر خاص عنایات تھیں، ان جلسوں کے فارغ اوقات کی نجی نشستوں میں قوم و ملت کی اصلاحات و ترقیات کے بارے میں باتیں ہوتی تھیں۔ خصوصاً مولویوں کے سیاسیات سے الگ ہو جانے کے باعث اسلامی حقوق کی پامالی دیکھ کر اصلاحی صورتوں پر دیر تک بحث رہتی تھی۔ آخر جمعیۃ علمائے بہار کی تشکیل کا عزم ہوا۔ اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بہار شریف تشریف لا کر تگ و دَو شروع کی۔ مسٹر سید محمد قاسم مرحوم (متولی صغریٰ وقف اسٹیٹ بہار) کو راضی کر کے مدرسہ عزیزیہ میں جلسہ کرنے کی اجازت لی۔ اور استقبالیہ کمیٹی قائم کر کے اس ناچیز کو صدر استقبالیہ مقرر فرمایا۔

پھر اس کے ماتحت کارروائی شروع کی۔ تاریخ جلسہ معین کرکے علمائے بہار کی خدمات میں دعوتی رقعے ارسال کیے۔ شوال ۱۳۳۶ھ میں حضرت مخدوم الملک شاہ شرف الدین احمد قدس سرہٗ کے عرس کے موقع پر یہ جلسہ طلب کیا گیا، اور مدرسہ عزیزیہ کے وسیع صحن میں شامیانے کے تلے علماء مدعوئین اور عوام کے جلسہ میں جمعیۃ علمائے بہار کی بنیاد رکھ دی گئی۔ حضرت مولانا شاہ سلیمان پھلواروی غفرلہٗ مع اپنے صاحبزادہ شاہ حسین میاں کے شریک تھے۔ اس میں حسین میاں سلمہٗ نے چند اشعار ایسے دل گداز لہجے میں ترنم کے ساتھ پڑھے تھے جس سے مجلس میں بے خودی کی کیفیت طاری ہوگئی تھی اور غالباً اب تک سامعین کے سامعہ میں وہ دل کش صدا گونج رہی ہوگی۔ پھر دوسرے سال پھلواری شریف میں بڑے پیمانہ پر اس کا جلسہ ہوا۔ مولانا آزاد سبحانی کو دعوت دے کر بلایا گیا۔ انھوں نے اپنی زبردست تقریر و سحر بیانی سے حاضرین میں جوش و ولولہ کی رُوح پھونک دی۔ جلسہ نہایت کامیاب رہا۔ اس میں شک نہیں کہ اس کامیابی میں حضرت شاہ سلیمان مرحوم کا بڑا ہاتھ تھا۔

پھر جب حضرت استاذ نے امارت شرعیہ بہار کی تمہید اٹھائی تو حضرت شاہ صاحب مرحوم نے اس کی تاسیس و تعمیر میں ساتھ دیا، لیکن امارت کے دوسرے دور کے بعد خیال نے پلٹا کھایا جس کے باعث دونوں ہستیوں کے درمیان مخالفت کی خلیج حائل ہوگئی۔

۱۳۳۸ھ میں جب کہ علماء کی سیاسی تحریک نومولود ہی کی حیثیت میں تھی، میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں مدرس ہوگیا اور جس سیاسی میدان میں مجھے کھینچ کر لایا گیا تھا وہاں سے واپس ہونا پڑا۔ مگر حضرت مولانا رح کی مدبرانہ طبیعت نے حالات و مقتضیات وقت کا لحاظ کرکے کبھی مجھے اپنے مشن میں حصہ لینے پر زور نہیں دیا، بلکہ مجھ کو اسی حال پر چھوڑ کر ایسے دائرۂ عمل میں داخل کرتے رہے جہاں خدمات مفوضہ سے ٹکر نہ ہو۔ اسی سال (۱۹۲۰ء) کا

واقعہ ہے کہ جبی مولانا سید شاہ عبید اللہ صاحب مجھری مدرس مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کی وفات سے انجمن محمدیہ پٹنہ سیٹی کی مستقل صدارت کی جگہ خالی ہو گئی تھی اس کے سالانہ جلسہ میں جو ہر سال امارت شرعیہ کی نگرانی میں منعقد ہوا کرتا ہے ناچیز کی غیر موجودگی میں صدارت کے لیے اس کا انتخاب کرا دیا گیا۔ اس انجمن کا نصب العین اصلاح و تبلیغ ہے اور میری خدمت کے مزاحم نہیں۔

غرض یہ کہ حضرت مفکر اعظم رح فکر و عمل کے ساتھ تدبیر کے بھی مالک تھے، اپنے تدبر و عمق نگاہی سے انجام کو بھانپ لیتے تھے اور جو ذرہ جہاں کام دے سکتا تھا وہیں اس سے کام لینے کی سعی فرماتے تھے۔

حضرت استاذ محترم مفکر اعظم رح مذہب و عمل میں حنفی تھے، لیکن تنگ نظروں کی طرح اہلسنت کے دوسرے فرقوں سے جنگ آزما نہ تھے، بلکہ فرماتے تھے کہ نماز کی مختلف صورتیں جو احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں، ایک ایک مرتبہ بھی سب پر عمل کر لینا چاہیے تاکہ کسی سنت کی برکات سے محرومی نہ رہ جائے۔

اس بیان سے ظاہر ہے کہ حضرت مولانا رح کے نزدیک احادیث مختلفہ میں اختلاف نسخ نہ تھا بلکہ اختلاف اباحت یا رخصت و عزیمت کا اختلاف تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اس تحقیقی مسلک کے ماتحت بہتیرے مذہبی اختلافات کا قلع قمع ہو جانا روشن ہے، مگر مسلمانوں کی بدنصیبی ہے کہ فروعات و اجتہادیات مسائل (جن میں بڑی وسعت تھی) کو معرکۃ الآراء بنا کر لَا تَنَازَعُوا کی نہی صریح اور اسی شغل میں رہ کر وَاعْتَصِمُوا کے امر اطلاق کو چھوڑ بیٹھے، جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کی زبوں حالی کا نقشہ سامنے ہے۔

حضرت ابوالمحاسن رح اوائل عمر ہی میں مُرید بھی ہو چکے تھے۔ حضرت قاری سید احمد

شاہ جہاں پوری نقشبندی قدس سرہٗ ایک متقی و متشرع بزرگ تھے۔ جن سے آپ کے خسر معظم حضرت مولانا سید وحید الحق بانی مدرسہ اسلامیہ بہار شریف رحمۃ اللہ علیہ اور بہار شریف واطراف بہار کے بہتیرے خوش خیال حنفی مرید تھے۔ حضرت مولانا رح کے بڑے بھائی صوفی احمد سجاد صاحب جو مجذوبیت کے عالم میں مست ہیں سید قدس سرہٗ کے خاص مریدوں میں ہیں۔

حضرت مولانا رح کا مشرب عقل و شرع کے مطابق، ان ارباب تصوف سے جُداگانہ تھا جنھوں نے نوافل و اَوراد کے سلسلۂ دراز میں اُلجھ کر اجتماعی شیرازہ کو پراگندگی سے محفوظ رکھنے کی نہ صرف ذمہ داری کا احساس ضائع کر دیا بلکہ اسی طریق عزلت کو حقیقت اسلام سمجھ کر عام دعوت و تلقین اور دعا و تسخیر کے ذریعہ وسیع کرنا شروع کر دیا۔ حضرت ابوالمحاسن رح کو اپنی فطری صلاحیت کے ساتھ ماحول بھی ایسا ملا جہاں نوافل و اَوراد کے اشغال شبانہ یوم، قومی و ملی خدمات اور مالی و جانی قربانیوں کے مقابل نہ صرف مرجوح بلکہ سنت کے طریق سے جُدا متصور ہوتے، پھر تبحّر علمی و نکات فہمی کی مزید تائید۔ آخران سب روشنیوں میں اصل حقیقت روشن ہو گئی کہ اسلام میں عبادت کی مانگ سے کہیں زیادہ اور شدید مانگ صداقت و امانت تقویٰ و طہارت، مالی و جانی قربانی کی ہے۔ اسی واسطے حضرت مولانا رح عبادات کے سلسلہ میں فرائض و مؤکدات پر اکتفا کر کے شب و روز فکر و عمل اور اعلائے کلمۃ اللہ میں لگے رہے۔

بعض اعتدال پسند دوستوں نے مولانا رح کو ان تمام خوبیوں کا حامل تسلیم کرتے ہوئے بتایا کہ ان سے ایک بڑی غلطی ہوئی کہ امارت شرعیہ کو پارٹی الیکشن میں استعمال کر کے امارت کو صدمہ پہنچایا کیوں کہ امارت ایک ہمہ گیر ادارہ ہے اس کی شان مسلمانوں کی پارٹی بندیوں کی لعنت دور کرنا تھی نہ کہ خود ایک فریق کی حیثیت اختیار کرنا ——— اس میں شک نہیں کہ ظاہر نظر میں یہ اعتراض وقیع معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقت میں یہ ایک بڑا مغالطہ ہے۔

جس کے ہمارے دوست شکار ہو گئے۔ بے شک پارٹی بندیوں اور تفرقہ اندازیوں کو ختم کر کے یا کم سے کم سب پارٹیوں میں ہم آہنگی پیدا کر کے وحدت قائم کرنا امارت کا نصب العین ہے۔ لیکن ساتھ ہی اسلامی قوانین وشعائر کے احترام کو باقی رکھنا بھی امارت کا اولین فریضہ ہے، اور آئین شرع کو اغراض پرستوں کے ہاتھ کھلونا ہونے سے بچانا عین مقصد امارت ہے۔

اب دیکھئے کہ موجودہ حکومت نے نمایندگان عوام کو ملکی قوانین بنانے کا اختیار دے رکھا ہے، مگر بدقسمتی سے مسلمانوں کا نمایندہ کونسلوں میں جاکر اسلامی آئین، مذہبی قوانین کے خلاف بلوں پر مہر تصدیق ثبت کر کے توہین اسلام کا مظاہرہ پیش کرتا ہے اور جب علمائے مذہب کی جمعیۃ تنبیہ کرتی ہے تو لبیک کہنے کے بجائے اس کو ٹھکرا دیتا ہے تو کیا آئین اسلام کے استحفاظ کے لیے کونسلوں میں ایسے ممبران بھیجنا ضروری نہیں جو اسلامیات کے متعلق علمائے دین کے فیصلہ کو شاہراہ عمل قرار دیں؟ اور ایسے افراد کو ممبر ہونے سے روکنا فرض نہیں جو کونسلوں میں پہنچ کر بلوں کے پاس کرنے میں شریعت کا پاس نہ رکھیں؟ اب اگر اس سلسلہ میں پارٹی بندی لازم آتی ہے تو امارت اس کی ذمہ دار نہیں ہے بلکہ وہ مطلق العنان امیدوار ہے اس واسطے پارٹی بندیوں کے الزام وجرم سے امارت کا دامن بالکل پاک ہے۔

امسال حضرت نائب امیر شریعت رح کو جمعیۃ علمائے ہند نے ناظم اعلیٰ مقرر کیا تھا اور اگرچہ آپ کی ذات اس عہدہ سے پیشتر بھی جمعیۃ کے لیے رُوح رواں تھی۔ لیکن جب کہ ارکان جمعیۃ کے اصرار سے اس عہدۂ نظامت کی باگ ہاتھ میں لی تو ایک جدید اسکیم کے ماتحت نئے اسلوب سے جمعیۃ کے چلانے کا کام شروع کر دیا تھا کہ ایسے نازک وقت میں ایثار وعزم کا یہ

پیکر مجسم ہمیشہ کے لیے ہم سے رخصت ہوگیا۔

قوم وملت کی اس سے زیادہ کیا بدنصیبی ہوسکتی ہے مگر مشیت ایزدی میں صبر ہی واحد علاج ہے۔ آپ ۹ روز بخار میں علیل رہ کر ۷ شوال ۱۳۵۶ھ کو دوشنبہ کے دن شام کے وقت رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اللہ آپ کی مساعی جمیلہ کو قبول فرمائے اور اپنے مقامِ قرب کے انعامات سے نوازے۔ آمین۔

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجّاد رحمۃ اللہ علیہ

از:- حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی

پہلی ملاقات

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب نائب امیر شریعت بہار سے میرا تعارف جمعیۃ علماء ہند کے واسطہ سے ہوا۔ میں نے ان کو دہلی میں سب سے پہلے جمعیۃ علماء کی ایک مجلس مشاورت میں دیکھا، اپنے قریب بیٹھنے والوں سے دریافت کیا تو انھوں نے مولانا مرحوم کا تعارف کرایا۔ اور نہ صرف یہ بلکہ میرے اور مولانا کے درمیان تعارف باہمی کا رشتہ بن گئے۔ اس وقت سے تادم وفات حضرت مولانا سے انتہائی ربط وضبط قائم رہا، اور ان کو بہت قریب سے دیکھنے کے ہزاروں مواقع ملتے رہے۔

طرز گفتگو مولانا محمد سجاد بہت کم گو تھے۔ مگر جس قدر بولتے تھے ان کی گفتگو پُرمغز ہوتی تھی گفتگو میں فطری حصر تھا اس لیے بات کرنے میں لکنت بھی کرتے تھے۔ اور اپنے مخصوص تکیہ کلام "نہیں نہیں" کو درمیان گفتگو میں لاکر حصر اور عجز لسانی کو توڑ دیا کرتے تھے۔ مگر جب کسی مسئلہ میں جوش آجاتا تھا تو تعجب اور حیرت میں دیکھا کرتا تھا کہ وہی شخص مسلسل اور بے تکان بولتا نظر آتا تھا۔

ان کے تکیہ کلام پر مولانا احمد سعید صاحب اکثر یہ لطیفہ کہدیا کرتے تھے "مولانا سجاد پر تو

گورنمنٹ کبھی بغاوت کا مقدمہ چلا ہی نہیں سکتی اس لیے کہ یہ جب کوئی جملہ فرماتے ہیں تو ساتھ میں فرما دیا کرتے ہیں "نہیں نہیں" اب بتائیے کہ اگر یہ حکومت برطانیہ کے مظالم بیان فرمائیں اور پھر "نہیں نہیں" بھی کہتے جائیں تو حکومت بدبخت کیسے ان پر مقدمہ چلائے۔ مولانا مرحوم اس لطیفہ کو سنتے تو سنجیدہ ہنسی کے ساتھ ہنس دیتے اور اس لطیفہ سے بہت محظوظ ہوتے تھے۔

علمی تبحّر

جمعیۃ علماء میں جب کبھی علمی مسائل پر بحث ہوتی تو مولانا سجاد صاحب کا اصل جوہر اس وقت کھلتا تھا۔ ہماری جماعت میں مشہور ہے کہ زبردست دلائل کے ساتھ کسی بات کو مدلّل کر کے بیان کرنا حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب کا خاص حصہ ہے اور یوں بھی مفتی صاحب کو فقہ اسلامی میں بڑا کمال حاصل ہے لیکن جماعت کے ذمہ دار ارکان اور میں نے بارہا یہ منظر دیکھا ہے کہ جب کسی مسئلہ پر حضرت مولانا محمد سجاد صاحب دلائل و براہین فقہی کے ساتھ بحث فرماتے تو حضرت مفتی صاحب بھی بے حد متاثر ہوتے اور ان کے علمی تبحّر کا اعتراف کرتے ہوئے بے ساختہ ان کی زبان سے کلمات تحسین نکل جاتے۔ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ مولانا سجاد "فقیہ النفس" عالم ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے مسائل کی روح سمجھنے کا ان کو فطری ملکہ عطا فرمایا ہے۔

حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ جو اس زمانہ میں علم حدیث کے مجدّد گذرے ہیں کا یہ فرمانا میرے نزدیک مولانا سجاد صاحب کے تبحّر علمی کے لیے ایک بہترین سند ہے۔ بعینہٖ یہی بات میں نے حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کی زبانی بھی سُنی ہے۔

تحریک خلافت

"فقہ" کے علاوہ بھی مولانائے مرحوم علوم نقلیہ و عقلیہ کے بہت بڑے عالم تھے اور تعلیم کے بعد عرصہ تک مدرسہ سبحانیہ

الٰہ آباد میں درس و تدریس کا مشغلہ جاری رکھا۔ تحریک خلافت نے اس حساس دل کو بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا اور مذہبی تعلیم کے ساتھ مسلمانوں کی اس سیاسی اور اجتماعی تحریک میں بھی اپنے کمالات اور جوہر استعداد کو خدمتِ اسلامی کے لیے نمایاں کیا۔ اور اس وقت سے سلسلۂ درس و تدریس ختم کر کے اسی خدمت میں آخر عمر تک مصروف رہے اور دن رات انتھک کام کرتے رہے۔

امارت شرعیہ

ہندوستان کے علماء اور غیر علماء تمام مسلمانوں میں یہ شرف صرف مولانا محمد سجاد صاحب کو حاصل ہے کہ انھوں نے یہ احساس کرتے ہوئے کہ "اس غیر اسلامی ملک میں مسلمانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں اسلامی ماحول اور اسلامی اثرات پیدا کرنے کے لیے" امارت شرعیہ" کے قیام کے بغیر چارہ کار نہیں، بہار کے صوبہ میں اس کی داغ بیل ڈال دی اور" امارت شرعیہ صوبۂ بہار کے لیے حضرت مولانا شاہ بدرالدین پھلواروی قدس سرہٗ العزیز کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اگرچہ وہاں کے بعض صوفیاء، بعض علماء اور انگریزی داں طبقے نے اپنی ذاتی مصالح کی بنا پر اس کی کافی مخالفت کی مگر مولانا کی سعی مشکور ثابت ہوئی اور اسلامی نظم و تنظیم کے لیے بہار میں بہرحال ایک نمونہ قائم ہو گیا اور تبلیغ اسلام، اصلاح رسوم، تنظیم زکوٰۃ، اہل مصرف میں اس کی صحیح تقسیم، مقدمات کے شرعی اصول پر طے کرنے کا سسٹم، یہ اور اس سلسلہ کے دوسرے اہم شعبہ جات اس مقدس ادارہ کا مقصد قرار پایا۔ اور چوں کہ مولانا موصوف نائب امیر شریعت منتخب ہوئے اس لیے اس ادارہ کی نگرانی اور اس کے استحکام کی ذمہ داری تمام تر مولانا موصوف ہی کے کاندھوں پر رہی اور صوبہ کے ان مسلمانوں نے جو پلیٹ فارم پر" اسلامی تحریک" اسلامی حکومت" کا نام رٹتے رہتے ہیں اگرچہ پیہم اور مسلسل مخالفتوں سے

اس کو بڑی حد تک نقصان پہنچایا اور اس مقدس تحریک میں "مناع للخیر" بنے رہے اور اس لیے یہ اسلامی ادارہ خاطر خواہ ترقی پذیر نہیں ہے تاہم اسلام اور مسلمانوں کی اجتماعی خدمت انجام دینے کے لیے آج بھی زندہ ہے۔

سیاسی بصیرت

حضرت مولانا کو جس طرح علوم نقلی و عقلی میں کمال حاصل تھا اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ سیاسی اجتماعی مسائل میں بھی ان کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ ہندو مسلم یونیٹی کانفرنس لکھنؤ، الٰہ آباد میں انھوں نے جس بصیرت سیاسی کا ثبوت دیا ہے اس کا اعتراف شرکاء کانفرنس ہندو مسلم دونوں نے کیا اور بعض سیاسی مبصرین نے خود مجھ سے یہ کہا کہ یہ شخص جب بات کرنا شروع کرتا ہے تو لکنت اور عجز گفتگو دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ خواہ مخواہ ایسے اہم مسائل میں کیوں دخل دیتا ہے لیکن جب بات پوری کر لیتا ہے تو یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اس شخص کا دماغ معاملات کی گہرائی تک بہت جلد پہنچ جاتا ہے اور تہ کی بات نکال کر لے آتا ہے۔

مراد آباد میں جب جمعیۃ علماء ہند کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا اور مولانا نے بحیثیت صدر خطبۂ صدارت سنایا تو زمیندار، انقلاب اور دوسرے اسلامی اخبارات نے خطبۂ صدارت پر ریویو کرتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ مولانا سجاد کی صورت اور گفتگو سے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ ایسا شخص بھی اسلامی سیاسیات بلکہ سیاسیات حاضرہ کا اس قدر مبصر اور عمیق النظر ہو سکتا ہے اور واقعہ بھی یہ ہے کہ مولانا کا یہ خطبۂ صدارت سیاسیات اسلامی کی بہترین انسائیکلوپیڈیا ہے۔

جمعیۃ علماء ہند حضرت مولانا محمد سجاد جمعیۃ علماء ہند کی نشأۃ کے ابتدائی دور ہی سے رہنمائی کرتے رہے اور اپنی فطری صلاحیتوں کے ذریعہ جمعیۃ علماء ہند کے

علمی نظام کے ترقی دینے میں برابر ساعی رہے اور ان کے قلم اور ان کے عمل دونوں نے جمیعۃ علماء کے مقاصد کو چار چاند لگانے اور اس کے اسلامی نظریوں کو بروئے کار لانے میں بہت زیادہ خدمات انجام دیں۔ یہ ان ہی کی خصوصیت تھی کہ خاموش زندگی رکھنے کے باوجود دن اور رات اکثر حصوں میں مسلمانوں کی مذہبی و سیاسی اجتماعی برتری کے لیے سوچتے رہتے یا پھر قلم کو حرکت دے کر اپنے صحیح افکار سے انقلاب پیدا کرنے کی سعی فرماتے یا عملی جدوجہد سے اس مقصد کو منصۂ شہود پر لانے کی فکر کرتے گویا یہ ان کی زندگی کا معمول بن گیا تھا۔

جنگِ آزادی

جمیعۃ علماء ہند نے اس اکیس سالہ سیاسی دور میں ہندوستان کے اندر اسلام کی سربلندی اور ملک و وطن کی آزادی کے لیے برٹش حکومت کے مقابلہ میں جب بھی "دائرۂ حربیہ" قائم کرکے سول نافرمانی کا آغاز کیا تو ہمیشہ مولانائے موصوف ہی اس ادارہ کے امیر یا انچارج مقرر ہوئے اور مولانا بے سرو سامان مجلس کے جھنڈے کے نیچے ہندوستان کے مختلف صوبوں کے ہزاروں مسلمانوں کی بہترین قیادت انجام دی، اور دائرہ حربیہ کے کام کو اس خوبی سے انجام دیا کہ اس سے بہتر اس اہم اور مشکل مہم کو انجام دینا دوسروں کیلیے بہت مشکل تھا۔

مولانا یوں تو عام سیاسی افکار و آراء میں بھی اگرچہ کافی بصیرت رکھتے تھے۔ مگر آئین (کانسٹی ٹیوشن) کی ترتیب میں مولانا کا دماغ بہت رسا تھا اور وہ اس سلسلہ میں بہت عمیق حقیقتوں پر بہت جلد پہنچ جایا کرتے تھے۔

چنانچہ جس زمانہ میں کانگریس نے اپنا فارمولا پیش کرکے یہ اعلان کیا تھا کہ اس کے علاوہ دوسری جماعتیں اگر اس سے بہتر نعم البدل پیش کر سکتی ہیں تو وہ مرتب کرکے ہمارے پاس بھیج دیں تاکہ غور و خوض کے وقت وہ بھی زیر بحث آئے تو اس سلسلہ میں جمیعۃ علماء نے جو بہترین فارمولا تیار

کر کے شائع کیا ہے اس کی ترتیب میں بھی مولانائے موصوف کی دماغی کاوش کو بہت بڑا دخل ہے۔

آخر میں سال گذشتہ جونپور کے سالانہ اجلاس کے بعد جمعیۃ علماء ہند کے جدید دستور العمل کے پیش نظر جب حضرت مولانا کا انتخاب ناظم اعلیٰ کے عہدہ کے لیے کہا گیا تو اگرچہ مولانائے موصوف نے امارت شرعیہ بہار اور جمعیۃ علماء بہار کے مشاغل و مصروفیتوں کی وجہ سے اس کو قبول کرنے میں بہت زیادہ پس و پیش کیا مگر ورکنگ کمیٹی کے اصرار پر جب قبول فرمالیا تو اس وقت سے اور وفات کے وقت تک زندگی کے اس تھوڑے وقفہ میں اندرونی تنظیم اور بیرونی نشر و اشاعت کے علاوہ جمعیۃ علماء کی یہ نمایاں خدمت انجام دی کہ جمعیۃ علماء کی بیس سالہ تبلیغی، دینی، سیاسی، اجتماعی خدمات اور عملی جد و جہد کا ایک مرقع تالیف فرمایا جو تذکرہ جمعیۃ علماء ہند کے نام سے معنون کیا گیا۔ اور یہ عجیب بات پیش آئی کہ باوجود اس امر کے کہ اس تذکرہ میں جمعیۃ علماء ہند کی گذشتہ خدمات کی فہرست مرتب کرنے اور مسلمانان ہند کے سامنے ان کی خدمات کی تفصیل کو یکجا کر کے ان کی توجہ کو جمعیۃ علماء ہند کی طرف زیادہ متوجہ کرنے کے سوائے اور کچھ نہ تھا مگر حکومت دہلی اس کو بھی برداشت نہ کر سکی اور فوراً اس کو ضبط کر لیا اور دفتر کی تلاشی لے کر اس کی تمام کاپیاں حاصل کر لیں اور ساتھ ہی حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب صدر جمعیۃ علماء ہند کا وہ معرکۃ الآرا خطبۂ صدارت بھی ضبط کر لیا جو جونپور کے اجلاس کی بہترین یادگار ہے۔ میں بلا شائبہ مبالغہ نہ صرف اپنی بلکہ اپنے تمام رفقاء کار کی متفقہ رائے کے مطابق کہہ سکتا ہوں کہ حضرت مولانا محمد سجاد صاحب کی شخصیت جمعیۃ علماء ہند کے مقاصد کی تکمیل میں زبردست معین و مددگار رہی اور ان کی وفات سے جمعیۃ علماء ہند کو ایک ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔

صوبۂ بہار میں آئینی حکومت

۱۹۳۶ء میں جب حکومت برطانیہ کی جانب سے ہندوستان کی تمام پارٹیوں کی مرضی کے خلاف ناقص اور بدترین آئین ہندوستان کے سر تھوپا گیا تو اس سلسلہ میں سیاسی جماعتوں نے الیکشن لڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ چنانچہ بہار میں بھی مختلف پارٹیوں نے اس کے لیے ہاتھ پاؤں چلائے اور جدوجہد کی۔ کانگریس کے علاوہ مسلمانوں میں ان حضرات کی جانب سے جو ہمیشہ سیاست کو اپنا پیدائشی حق سمجھتے اور مولوی اور عالم کے لیے شجر ممنوعہ قرار دیتے ہیں، دو پارٹیاں سامنے آئیں، ایک مولوی شفیع داؤدی صاحب کی پارٹی جس نے اپنا نام احرار پارٹی رکھا اور دوسری سید عبدالعزیز صاحب کی پارٹی جو بہار کے وزیر تعلیم رہ چکے تھے اور اب حیدرآباد میں معزز عہدہ پر فائز ہیں۔

ان سیاسی اجارہ داروں کے مقابلہ میں اس غریب مُلّا نے بھی اپنی پارٹی کی ترتیب دی جس کا بنیادی لائحہ عمل یہ قرار پایا کہ وہ تمام مذہبی و سیاسی امور میں امارت شرعیہ کی قیادت کو تسلیم کرتی ہے اور اس پارٹی کا نام انڈی پنڈنٹ پارٹی رکھا گیا۔ مولانا محمد سجاد صاحب کے خلوص، دیانت، اسلامی خدمات کا اس صوبہ کے مسلمانوں پر کتنا اثر تھا یہ اس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ اجارہ داروں کی ہر قسم کی دراندازیوں کے باوجود کانگریس کے بعد انڈیپنڈنٹ پارٹی اسمبلی کی دوسری طاقت قرار پائی اور احرار پارٹی تو دفن ہی ہوکر رہ گئی اور میاں سید عبدالعزیز صاحب کی پارٹی کو بھی ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا۔

طرفہ ماجرا یہ ہوا کہ انتخابات میں کامیاب ہونے کے بعد جب کہ کانگریس اور حکومت کے درمیان وزارت کے قبول و عدم قبول کے بارہ میں رسہ کشی ہو رہی تھی تو مولانا محمد سجاد صاحب نے

اپنی پارٹی کی میٹنگ طلب فرمائی۔ اس پارٹی کا پارلیمنٹری بورڈ جن ارکان پر مشتمل تھا اس کی صدارت مولانائے مرحوم کے سپرد تھی اور لیڈر پارٹی مسٹر یونس تھے۔ پارٹی نے بحث و مباحثہ کے بعد یہ طے کیا کہ بہار میں چوں کہ حکومت کے پچھلے ریکارڈ میں بعض ایسے امور موجود ہیں جو مسلمانوں کے لیے بحیثیت ایک قوم کے عرصہ سے نقصان دہ ہیں اس لیے عارضی وزارت کو قبول کر لینا مناسب ہے لہٰذا یونس صاحب نے وزارت ترتیب دے کر قلمدان وزارت سنبھال لیا اور اس طرح بہار کی حکومت اگرچہ یونس صاحب کی وزارت کے ہاتھ میں تھی مگر دراصل پارٹی کے پارلیمنٹری بورڈ کا صدر حضرت مولانا محمد سجاد صاحب اس حکومت کے روح رواں تھے۔ ظاہر میں تو یہ ایک معمولی واقعہ تھا جو ہو گذرا لیکن کیا یہ کم حیرت و تعجب کی بات ہے کہ جن صوبائی وزارتوں کا یہ حال رہا ہے اور آج بھی یہ حال ہے کہ مسلم لیگ کے اس زور و شور اور مسٹر جناح کی قیادت کے اس ہنگامہ کے دور میں کہ بقول مسلم لیگ جمہور مسلمان لیگ کے ساتھ ہیں آج تک ایک صوبہ میں بھی مسٹر جناح اور ان کی مسلم لیگ کو خالص لیگی وزارت حاصل نہ ہو سکی اور کسی صوبائی لیجسلیچر پر بھی ان کو کامل اقتدار حاصل نہیں ہے۔ ایک صوبہ میں ایک بوریہ نشین کی معمولی جد و جہد سے اس کی پارٹی کو اگرچہ عارضی سہی مگر وہ اقتدار حاصل ہو گیا جس کے ذریعہ اُن سے بہار میں ہندی رسم الخط کے سرکاری رسم الخط ہونے کے ساتھ ساتھ اردو رسم الخط کو بھی سرکاری حیثیت دے دی۔ اور بعد میں کانگریس گورنمنٹ کو بھی اس حیثیت کو برقرار رکھنا پڑا، اور اس کو مضبوط بنا دیا۔ اسی طرح بعض اور ایسے مسائل بھی طے کیے جو مسلمانوں کے جائز حق تھے اور برٹش گورنمنٹ کے عمال بہار نے ان کو کبھی منظور نہیں کیا تھا۔

شرکت کانگریس

یہ واقعہ ہے کہ حضرت مولانا محمد سجاد صاحب بھی ان بزرگوں میں سے ایک بزرگ ہیں جو اپنی

سیاسی بصیرت کے ساتھ تحریک آزادی میں کانگریس کے ساتھ اشتراک کو مسلمانوں کے لیے مفید اور ضروری سمجھتے تھے۔ اس لیے ان کا نظریہ یہ تھا کہ نظام اسلامی کے لیے ہندوستان میں بہ اسباب ظاہری اس وقت تک کوئی صورت نہیں بنتی جب تک ہندوستان کی قومیں مل کر برٹش حکومت کے جوئے کو اپنے کاندھوں سے اتار کر نہ پھینک دیں۔ اور یہ تشریح فرماتے تھے کہ جمعیۃ علماء ہند کے اس اصول کا پابند ہو کر جائیے کہ ہماری سیاست ہمارے مذہب کے تابع ہے۔

چنانچہ مولانا محمد سجاد مرحوم کی عملی زندگی جمعیۃ علمائے ہند کے اس نظریہ کے ماتحت ہمیشہ نمایاں رہی اور انھوں نے جس طرح ملک اور وطن کی آزادی کے تمام مسائل میں خصوصاً جنگ آزادی میں کانگریس کا ساتھ دیا اسی طرح جب اور جس موقع پر بھی کانگریسی حکومتوں نے کوئی ایسی ٹھوکر کھائی جس سے مسلمانوں کے کاز کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو فوراً مولانا مرحوم نے ڈٹ کر اس کا مقابلہ کیا اور بالآخر کانگریس حکومت کو اپنے مطالبہ حق کے سامنے جھکا لیا۔ بہار کانگریس گورنمنٹ کے زمانہ میں ٹیننسی ایکٹ (زمینداره قانون) کے ماتحت جائدادوں پر ٹیکس کا جب مسئلہ پیش ہوا تو مولانا نے اپنی پارٹی کے ارکان سے یہ ترمیم پیش کرائی کہ اوقاف اسلامی کو اس ٹیکس سے مستثنیٰ رکھا جائے مگر اس اسلامی نقطہ کو کانگریس منسٹری میں کوئی نہ سمجھ سکا اور بالآخر حضرت مولانا ابوالکلام آزاد تشریف لائے اور انھوں نے بحث و تمحیص کے بعد کانگریس حکومت کو یہ حکم دے دیا کہ وہ اس مطالبہ کو تسلیم کرلے کیوں کہ بلاشبہ یہ مسلمانوں کا مذہبی مطالبہ ہے۔ اسی طرح قربانی گاؤ کے معاملہ میں بھی انھوں نے بہار کانگریس حکومت سے اسلامی مطالبات منوانے میں اپنی فطری جرأت حق کا ثبوت دیا۔

یوپی میں کانگریس حکومت کے زمانہ میں جب شیعہ سنی قضیہ چل رہا تھا اور جس کی

بنیاد دراصل برٹش حکومت کے عمال نے رکھی تھی یعنی السپ کمیٹی کی رپورٹ میں جو فیصلہ کیا گیا تھا اس نے سنیوں کے جائز اور واجبی حق پر ظلم کی چھری چلادی تھی اور جب چھتاری وزارت عارضی وزارت کی شکل میں مرتب ہوئی تو اس نے بھی السپ کمیٹی کی رپورٹ کے ان الفاظ کو جو تبرا اور مدح صحابہ دونوں کو ایک حیثیت میں رکھتے تھے، بدل کر جرأت حق کا ثبوت نہ دیا مگر جب عارضی وزارت کے بعد کانگریس نے وزارت قبول کی تو اس نے اس قدر جرأت حق کا مزید ثبوت دیا کہ تبرا کو بداخلاقی اور جرم قرار دے کر مدح صحابہ کے جائز حق کو تسلیم کیا۔ اور رپورٹ کے ان جملوں کو مسترد کردیا جو قطعاً ناواجب اور صریح ظلم تھے۔ اور اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ یہ جو کچھ ہوا حضرت مولانا آزاد کے تدبر اور احقاق حق کی بدولت ہوا لیکن اس کے باوجود اس نے بھی سنیوں کا یہ حق عملی شکل میں لانے کی کوئی سہولت بہم نہیں پہنچائی۔

چنانچہ اس سلسلہ میں لکھنؤ میں سنیوں کی مختلف جماعتوں کی جانب سے اضطراب پیدا ہونے لگا اور آخرکار ان تمام امور سے متاثر ہوکر جو اس معاملہ میں تیس پینتیس سال سے ہو رہے تھے حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب صدر جمعیتہ علماء ہند نے جن کے علمی تبحر، دیانت، تقویٰ، صداقت و خلوص کا دوست و دشمن دونوں کو اعتراف ہے" آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر ہونے کے باوجود جب یوپی کانگریس گورنمنٹ کے خلاف علم جہاد بلند کیا اور سول نافرمانی کا ارادہ کرلیا تو اس وقت بھی مولانا سجاد صاحب ہی ان کے دست و بازو اور مشیر کار تھے۔

سادگی اور ایثار نفس

ان تمام خوبیوں کے باوجود جو ابوالمحاسن کے "محاسن" کا لب لباب ہیں اس بزرگ ہستی کی زندگی کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ ایک نہایت سادہ اور منکسر المزاج انسان تھے۔

قناعت کا یہ عالم تھا کہ کھانے پینے اور پہننے غرض معاشرتی زندگی میں پندرہ بیس روپیہ ماہانہ کی حیثیت کے انسان سے زیادہ گذران نہ رکھتے تھے۔ اخلاق کا پیکر تھے، انکسار فطرت بن گیا تھا مگر جرأت حق اور اعلائے کلمۃ اللہ کے بارے میں ایک بپھرے ہوئے شیر اور مرد مجاہد تھے، اصابت رائے اور فکر بلند کے حامل اور علم و عمل کی چلتی پھرتی مشین تھے۔

وفات حسرت آیات

جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ جمعیۃ علماء ہند کی نظامت اعلیٰ کو سنبھالے ہوئے ابھی چند ہی مہینے ہوتے تھے اور جمعیۃ علماء کے نظام میں اپنے عہدہ کے پیش نظر ابھی تھوڑا ہی قدم بڑھایا تھا کہ پیغام اجل آپہنچا اور اس مرد حق نے اپنے رفقاء کار کو ماہی بے آب کی طرح تڑپتا ہوا چھوڑ دیا۔ میں ایک صبح کو راولپنڈی جیل میں بیٹھا ہوا اخبار پڑھ رہا تھا کہ انقلاب اور ملاپ میں جمعیۃ علماء ہند کا ایک برقیہ نظر سے گذرا جس میں یہ حسرت زدہ الفاظ درج تھے:

"کل پھلواری شریف (پٹنہ) میں حضرت مولانا ابوالمحاسن سید محمد سجاد صاحب ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند کا چند روز علیل رہ کر انتقال ہو گیا"

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کہتا ہوا دل پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اور پھر دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے اپنے اکابر و احباب کے نام خدا جانے مرثیہ خوانی میں کیا کچھ لکھ گیا اور اس طرح دل کے بوجھ کو ہلکا کیا۔

اب تو اس دعا پر اس نامکمل مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ حضرت مرحوم کو فردوس عطا فرمائے اور اپنی تجلیات و رحمت بیکراں کی آغوش سے اُن کو نوازے۔ آمین۔

حضرت مولانا محمد سجادؒ

از: حضرت مولانا شاہ محمد محی الدین صاحب امیر شریعت ثانی رح

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد غفر اللہ لہٗ ورحمہٗ کا حادثۂ ارتحال بے حد جاں سوز اور صبر آزما ہے ایسی ذات جس نے دین و مذہب کی حمایت اور مسلمانوں کی اصلاح میں جان و دل و عافیت و آرام سب کچھ لٹا دیا تھا۔ خلوص مجسّم تھے۔ یہ ان ہی کا دل و جگر تھا کہ ایسی حالت میں کہ ایک طرف اکلوتا بیٹا "حسن سجاد" مرحوم کی جس کی عمر چوبیس پچیس سال ہوگی، جب عالم فاضل ہو کر مختلف صلاحیتوں کا مجسّم بن کر باپ کی آرزوؤں کا مرجع بنتا ہے اور باپ کی بہیتری امیدیں اس کی ذات سے وابستہ ہوتی ہیں، حمی محترقہ میں مبتلا ہوتا ہے اور دوسری طرف دینی اور جماعتی ضرورت داعی ہوتی ہے کہ فوری طور پر مظفرپور اور چمپارن کے علاقہ میں پہنچیں، اس کش مکش کے امتحان کی بھٹی میں کھرے سونے کی طرح نمایاں اور اجاگر ہوتے ہیں۔ اور نسبی علائق، پدری شفقت، دنیاوی اور مادی محبت پر دین و مذہب کی حمایت اور مسلمانوں کی فلاح و اصلاح کا جذبہ غالب آتا ہے اور علالت کی اطلاع و خبر کے باوجود اس کی تیمارداری کے سر و سامان کو دوسرے کے سپرد کر کے خود اللہ کی راہ میں رخت سفر باندھ کر روانہ ہو جاتے ہیں۔ پھر وہاں پہنچ کر مصیبت زدگان زلزلہ کے سلسلہ میں مظفرپور اور بتیا کے دیہاتوں کے امدادی کام میں ہمہ تن مشغول ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ لڑکے کی حالت خراب ہوئی، تار پر تار گئے، جواب میں علاج کرانے کی ہدایات دیتے رہے

آخر کار آدمی گیا اور ان کو جبراً لایا گیا۔ جب گھر پہنچے تو یہ جوان لڑکا سکرات میں مبتلا تھا اور چند گھنٹوں میں انتقال کر گیا۔ اس حادثہ جانکاہ کا اتنا اثر بھی نہ لیا کہ دو ہفتہ بھی گھر بیٹھ کر غم والم کی گھڑیوں کو سکون سے گزارتے اور تعزیت کرنے والوں کی آمد و رفت اور کلمات صبر سے سہارا حاصل کرتے۔ صرف پانچ دن مکان پر بہ ضرورت خاص ٹھہرے اور پھر اپنے کام پر چل کھڑے ہوتے۔ جس وقت وہ پھلواری شریف پہنچے اور میں نے ان کو دیکھا، مجھے حیرت ہوگئی کہ جس کے باغ امید کا شاداب پھول ابھی خاک میں مل چکا ہے ان کے چہرے بشرے سے ذرا بھی غم کے آثار ظاہر نہیں ہیں پھلواری میں بھی قیام کرنا کیسا، دوسرے یا تیسرے دن علاقہ چمپارن کے اطراف پھر اپنے کام میں چلے گئے۔ یہ ایسی ہی ذات سے ہو سکتا ہے جو راہ خدا میں خلوص مجسم ہو، جس کے دل میں اللہ اور رسول کی محبت بال بچوں اور مال و منال اور تمام چیزوں کی محبت پر غالب ہو اور یہی مومن کامل کی خصوصیت ہے۔

اخلاص کے ساتھ مولانا سجاد پیکر عمل اور کامل مدبر بھی تھے۔ مفید تحریکات پیدا کرنا پھر اس کو عمل میں لانے کی جو صلاحیت رکھتے تھے، اس صلاحیت کا دوسرا آدمی نظر نہیں آتا۔

جہاں تک مجھے یاد آتا ہے، خلافت کمیٹی جو تمام ہندوستان پر چھا گئی تھی اور جس نے سلطنت کی بنیاد کو ہلا دیا تھا، اس کی ابتداء کرنے والوں میں مولانا عبدالباری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ وہ بھی شریک تھے۔ خلافت کمیٹی بمبئی میں قائم ہوئی تھی، پھر مولانا لکھنؤ آئے، وہاں قائم ہوئی، پھر صوبہ بہار میں سب سے پہلے گیا میں آکر قائم کیا اور اس کا دوسرا اجلاس پھلواری میں کیا۔ اس کے بعد ہندوستان کے مختلف حصوں میں قائم ہوئی۔

جمعیۃ علماء ہند کے قیام کے لیے ہندوستان کے اکثر صوبوں میں سفر کر کے علماء میں

اس کی تبلیغ کی اور لوگوں کو آمادہ کیا، لیکن عمل کی طرف پہلا قدم مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا تھا چنانچہ پہلا اجلاس ہندوستان میں جمعیۃ کا بنام انجمن بہار شہر بہار شریف میں بزمانہ عرس حضرت مخدوم الملک منعقد ہوا۔ اس کے بعد جمعیۃ علماء ہند قائم ہوئی اور اس کے بعد مختلف صوبوں میں شاخیں قائم ہوئیں اور پھر علماء نے مستعد ہو کر کام شروع کردیا اور الحمدللہ کہ آج ہندوستان کے ہر صوبہ میں جمعیۃ علماء قائم ہے اور جس قدر مفید کام اسلام اور مسلمانوں کا انجام دیا وہ دنیا پر ظاہر ہے۔

اس وقت کہ ہندوستان کے بہترین دماغ، انقلاب کی نیم خفیہ تدبیریں سوچ رہے تھے، مولانا نے وقت کی صحیح شرعی ضرورت کو سمجھا کر اور شرعی تنظیم کے اصول علماء کو یاد دلائے اور اس طرح امارت شرعیہ کی قیام کی تحریک تمام ہندوستان میں پھیلائی۔ اس کے لیے علماء و زعمائے ہند کے پاس متعدد سفر کیے۔ جہاں تک مجھ کو یاد ہے، سال دو سال تک پیہم مخصوص طور پر اس کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ بالآخر علماء صوبہ بہار کے ذریعہ زعماء اور علماء کی ایک بڑی جماعت کو جمع کر کے اس کی بنیاد ڈالی اور صوبہ بہار میں امارت شرعیہ قائم کیا۔ بعد کو اس میں اختلافات بھی پیدا کیے گئے، لیکن دنیا کی کوئی طاقت اس کو عزم و استقلال کو اپنی جگہ سے متزلزل نہ کرسکی اور بحمداللہ امارت شرعیہ اپنا کام حسب استعداد برابر کرتی رہی اور کررہی ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ کرتی رہے گی۔ علیہ توکلت والیہ انیب۔

سیاست پر گہری نظر رکھتا اور ہر ایسے موقع پر جب کہ کسی سیاسی رفتار سے اسلام و مسلمین کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو، اس کے مقابلہ میں کھڑے ہوجانا اور تقریر و تحریر پر اور جس عنوان سے ہو سکے اس کی مدافعت کی سعی کرکے دیگر علماء کے سر سے اس فرض کفایہ کو اتارنا ان ہی کا کام تھا۔ ہر سیاسی تحریک کو مذہب کے مطابق کرکے چلانے کی سعی کرنی اور ایسی صورتیں اپنی کمال

تدبر اور غور و خوض سے پیدا کرنی کہ کوئی سیاسی تحریک مذہب اسلام کے مخالف نہ ہو، بلکہ اسلامی اصول کے مطابق کر کے چلائی جائے۔ ان ہی کی ذات کی خصوصیت تھی جو آج اپنے اعلیٰ تر دماغ اور گنجینۂ برکات واستقلال دل کے ساتھ آغوشِ لحد میں ہمیشہ کے لیے راحت و آرام کے ساتھ آسودہ ہے اور روح پاک و متجلی "علیین" سے اپنے پسماندگان کی طرف نظر دوختہ ہے کہ جن کھیتوں کو میں نے اپنے خون سے سینچا ہے یہ لوگ اس کی آبیاری بھی کرتے ہیں یا خود غرضی و تن آسانی کے بھینٹ چڑھاتے ہیں۔ برد اللّٰہ مضجعہ طاب ثراہ وانا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

میں بہ عجز و نیاز دربار رحیم وکریم میں دست بہ دُعا ہوں کہ مرحوم کو ان کے اعمال اور نیکیوں کا اور خدمت اسلام و مسلمین کا نیک ثمرہ عطا کرے اور جزائے خیر دے اور جوار رحمت میں جگہ دے اور مغفرت فرمائے اور امت مسلمہ کے حال پر رحم و کرم کر کے اس کی دین و دنیاوی فلاح و نجات کے لیے مرحوم کا بدل عطا کرے۔

ذلک علی اللّٰہ بعزیز آمین یا من اذا اراد بہ شیئاً ان یقول لہ کن فیکون اللّٰہ بیدہ ملکوت کل شئ والیہ ترجعون۔

حضرت سجادؒ کے متعلق چند کلمات

حضرت مولانا حافظ احمد سعید صاحب نائب صدر جمعیۃ علماء ہند، دھلی

میں نے بجنور کے جلسہ میں اپنا خطبۂ صدارت پڑھتے ہوئے حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کے متعلق چند کلمات کہے تھے، آج اسی اجمال کی تفصیل کرنا چاہتا ہوں، اگرچہ تفصیل بھی ایک قسم کی اجمال سے زیادہ نہ ہوگی، کیوں کہ مولانا مرحوم کے فضائل اس قدر کثیر ہیں کہ ان کے تذکرے کے لیے دفتر ناکافی ہیں۔ ایک صحیح انسان میں جو خوبیاں اور کمالات ہونے چاہئیں اللہ تعالیٰ نے مولاناؒ کی ذات میں وہ سب جمع کر دیئے تھے۔

ابتدائی ملاقات

مولانا مرحوم سے سب سے پہلی ملاقات جہاں تک مجھے یاد ہے خلافت کانفرنس میں ہوئی یہ خلافت کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی تھی۔ اسی خلافت کانفرنس میں بعض اہل علم نے یہ مشورہ کیا کہ ہندوستان کے علماء کی تنظیم ہونی چاہیے، چنانچہ علماء کی ایک مختصر اور مخصوص جماعت کا خفیہ اجتماع دہلی کے مشہور بزرگ سید حسن رسول نما رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ پر منعقد ہوا۔ اس میں تمام حضرات نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ حضرت مولانا محمد سجاد صاحب نے بھی اس جلسہ میں

ایک مختصر تقریر فرمائی تھی۔ اس تقریر کا ایک ایک لفظ مولانا کے جذبات ایمان کا ترجمان تھا، حاضرین کی تعداد اگرچہ دس بارہ آدمیوں سے زیادہ نہ تھی لیکن کوئی آنکھ اور کوئی دل ایسا نہ تھا جس نے اثر قبول نہ کیا ہو۔

یہ مجلس اگرچہ دو گھنٹے سے زیادہ کی نہ تھی۔ ایک گھنٹہ بحث و مباحثہ میں صرف ہوا اور ایک گھنٹہ عہد و پیمان میں صرف ہوا۔ لیکن اسی جلسہ کا یہ اثر تھا کہ جمعیۃ علماء ہند قائم ہوئی، اور اس کا پہلا جلسہ امرتسر میں خلافت کانفرنس کے ساتھ منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی رہائی کے متعلق ایک تجویز پاس ہوئی۔ جمعیۃ علماء کے اس پہلے اجلاس میں بھی حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد مرحوم شریک ہوئے، انھوں نے اپنے خیالات کا پھر اعادہ فرمایا۔ اس اجلاس کے صدر حضرت مولانا عبدالباری رحمۃ اللہ علیہ تھے۔

جمعیۃ علماء ہند کا دوسرا اجلاس

یہ جلسہ دہلی میں منعقد ہوا۔ اس جلسہ کے صدر حضرت مولانا محمود الحسن قدس سرہٗ تھے ہر چند کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ علالت کی وجہ سے اس اجلاس میں شریک نہ ہو سکے اور اجلاس کی تمام کارروائی کا اکثر حصہ حضرت علامہ مفتی محمد کفایت اللہ صاحب مدظلہ کے زیر صدارت انجام پذیر ہوا، لیکن تمام کاروائی کا علم حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو ہوتا رہا اور ہر تجویز پیش ہونے سے قبل حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بغرض منظوری پیش کی جاتی رہی۔ اس اجلاس کی یہ خصوصیت تھی کہ اس میں تمام ہندوستان کے علماء کی نمائندگی تھی۔

ہندوستان کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا، جہاں سے علما تشریف نہ لائے ہوں، اس اجلاس میں حکومت برطانیہ سے عدم تعاون کی تجویز پاس ہوئی۔ عدم تعاون کی تجویز کے سلسلے میں جو فتویٰ

مرتب کیا گیا اور جیس کا نام آگے چل کر پانچ سو علماء کا متفقہ فتویٰ ہوا۔ وہ حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مرتب کیا ہوا تھا۔ فتویٰ اگرچہ گورنمنٹ برطانیہ سے عدم تعاون کے سلسلے میں تھا۔ لیکن اس فتویٰ سے مولانا کے اس تبحرعلمی کا پتہ چلتا ہے جو مولانا کو قدرت کی جانب سے عطا ہوا تھا۔ اس اجلاس کے بعد مولانا سے تعلقات وسیع ہو گئے۔ جمعیۃ علماء کے اس تاریخی اجلاس کی سبجکٹ کمیٹی میں بھی مولانا نے ایک تقریر فرمائی تھی اور وہ تقریر اپنی آپ ہی نظیر تھی۔

مولانا ابوالمحاسن محمد سجّاد کا نظریہ

حضرت مولانا ابوالمحاسن مرحوم سے جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے، ۱۹۲۰ء سے میرے تعلقات وسیع ہوئے اور ان تعلقات نے اتنی محبت اور وسعت پیدا کر لی کہ بلاشبہ اگر ان تعلقات کو باپ بیٹے کے تعلقات سمجھا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ مولانا مجھ سے اپنی اولاد کی طرح محبت کرتے تھے، اور میں ان کی عزّت اور ان کا احترام باپ کی طرح کرتا تھا، اور بعض جلسوں میں میں نے ان کی موجودگی میں ان تعلقات کا اظہار بھی کیا تھا، اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کے خدام میں مجھ سے زیادہ کوئی ان کا رازدار نہ ہوگا۔ سفر اور حضر میں مولانا سے صدہا بار تبادلۂ خیالات کا موقع میسر آیا ہے، اور بعض موقع پر میں نے اور انھوں نے ایک ماہ سے زائد سفر کیا ہے اور مجھے ان کی ہمرکابی کا شرف حاصل رہا ہے۔ اس بیس سالہ زندگی میں بارہا ان سے مختلف مسائل پر گفتگو ہوئی ہے۔ فقہ، حدیث، قرآن تینوں چیزوں میں میں نے ان کی نظر کو وسیع اور ان کے علم کو مستحضر پایا۔ اگر مولانا کی زندگی کے واقعات کو میں قلم بند کروں تو اس کے لیے بڑے وقت کی ضرورت ہے۔ اس لیے میں اس موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے ہچکچاتا ہوں کہ ان سب باتوں کو قلم بند نہ کر سکوں گا، جو مجھ کو سفر اور حضر میں مولانا کے ساتھ پیش آتی رہیں۔

بہار کا زلزلہ

بہار میں جب ہولناک زلزلہ کا حادثہ پیش آیا تو جمعیۃ علماء ہند کے ایک وفد نے حضرت مولانا محمد سجاد کی رہنمائی میں تمام برباد شدہ رقبہ کا دورہ کیا۔ اس دورے میں مجھے مولانا کی معیت کا شرف حاصل ہوا۔ یہ لوگ تقریباً ہر قصبے اور موضع میں گئے۔ یہ دورہ کم وبیش ایک ماہ تک جاری رہا۔ ہر ایک مقام پر تقریریں بھی ہوتی رہیں۔ حضرت مولانا محمد سجاد صاحب نے بھی مختلف مقامات پر متعدد تقریریں کیں۔ شب و روز کی پیہم اور مسلسل صحبتوں میں مولانا کے خیالات سے اور ان کے نظریات پر تبادلۂ خیالات ہوا۔ بعض قرآن کی آیتوں کی تفسیر اور شرح بھی مولانا نے بیان کی، ان کا نظریہ اور ان کا نقطۂ نگاہ بالکل صاف اور روشن تھا۔ ان میں کوئی بناوٹ نہ تھی، وہ تصنع سے بالکل بری تھے۔ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی زندگی کو بغیر امیر کے غیر شرعی زندگی سمجھتے تھے۔ کسی اسلامی ملک پر کفار کے تسلط کو وہ نہایت تشویش کی نظر سے دیکھتے تھے، اور اس غیر شرعی زندگی پر وہ قرآن وحدیث سے استدلال کرتے تھے، اور بعض دفعہ اس زندگی کی خرابیاں ذکر کرتے کرتے رونے لگتے تھے، اور اس قدر روتے تھے کہ ان کی ہچکی بندھ جاتی تھی۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ قیامت کے دن جو سوال ہم لوگوں سے ہوگا اس کا جواب سمجھ میں نہیں آتا۔ ہم خدا کے سامنے کس طرح عہدہ برآ ہوں گے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ کفر کے اس بے پناہ غلبہ اور اثرات کو جس قدر کم کیا جا سکے کم کرنا چاہیے۔ اس راستے میں جس قدر قربانیاں پیش کرنے کی ضرورت ہو اس سے دریغ نہ کیا جائے، جن چیزوں میں حکومت متسلطہ مداخلت نہیں کرتی اور جو چیزیں اس کی دست برد سے باہر ہیں، ان میں اپنا مکمل نظام قائم کیا جائے۔ وہ فرمایا کرتے تھے اسلام ایک تنظیمی مذہب ہے، اس مذہب

کی روح ڈسپلن اور نظم چاہتا ہے۔ اگر مسلمان منتشر رہیں اور کسی ایک شخص کی اطاعت نہ کریں اور اپنا کوئی امیر منتخب نہ کریں تو یہ زندگی غیر شرعی زندگی ہوگی۔ ہر ایک پیغمبر جو دنیا میں آیا ہے اس نے اپنی ابتدائی تقریر میں دو باتیں لازمی طور پر کہی ہیں۔ فاتقوا اللّٰہ واطیعون۔ یعنی اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اور یہی اطاعت وہ چیز ہے جس پر قوموں نے مخالفت کی ہے، عام طور سے قومیں خدا کی قوت اور طاقت تسلیم کرنے کو آمادہ ہو جاتی تھیں۔ لیکن پیغمبر کی اطاعت پر رضامند نہ ہوتی تھیں۔ پیغمبر کی اطاعت کو وہ اپنی عزت و برتری اور اپنی سرداری کے منافی سمجھتی تھیں، اس وجہ سے کہتے تھے ماھذا الا بشر مثلکم یرید ان یتفضل علیکم۔ یعنی یہ پیغمبر بھی ہم تم جیسا آدمی ہے، یہ اپنی بڑائی منوانی چاہتا ہے اور ہم پر حکومت کرنا چاہتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو مکہ کے سرداروں کو کھٹکی اور یہی وہ امر ہے جس نے اہل کتاب کو نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے باز رکھا۔ اسی نقطہ پر قوموں سے مخالفت ہوئی، لیکن پیغمبر اس حق سے دست بردار ہونے پر آمادہ نہ ہوئے اور انھوں نے صاف کہہ دیا کہ خدائی مذہب ہی بنیادی چیز ہے۔ جب تک پیغمبر کی اطاعت پر تیار نہ ہو خدائی مذہب کی تکمیل نہیں ہو سکتی اور تنظیمی زندگی بھی میسر نہیں آسکتی۔ اس نظریہ کے پیش نظر انھوں نے امارت شرعیہ کی بنیاد ڈالی تھی، ان کا نظریہ یہ بھی تھا کہ جب تک حکومت کافرہ کا مسلمانوں پر تسلط ہے اور جب تک مسلمان اس ابتلاء میں مبتلا ہیں اور جس وقت تک مسلمان سیاسی اقتدار کے مالک نہیں ہو جاتے اس وقت تک اپنے اقتصادی اور معاشرتی کاموں کے لیے اپنا ایک امیر منتخب کریں اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری پر بیعت کریں، تاکہ اس کفرستان میں جس قدر ممکن ہو سکے مسلمان اپنی زندگی کو شرعی بنا سکیں۔ وہ اس مسئلے پر فقہاء حنفیہ کی تصریحات

پیش کرتے تھے، اس پر انھوں نے ایک مفصل فتویٰ بھی مرتب کیا تھا اور جمعیۃ علماء نے جو تجویز امارت شرعیہ کے سلسلے میں پاس کی تھی وہ بھی ان ہی کی سعی کا نتیجہ تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ زکوٰۃ اور عشر کا صحیح انتظام ہو سکے اور مسلمانوں کے صدقات وخیرات شرعی طریقہ پر صحیح مصارف پر خرچ ہو سکیں۔ یہ حقیقت ہے کہ حضرت مولانا محمد سجاد صاحب کی یہ خواہش ایک شرعی خواہش تھی اور ۱۸۵۷ء کے اس انقلاب کے بعد جو ہندوستان میں ظہور پذیر ہوا اور جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی دولت، ان کی عزت اور ان کی شرعی زندگی اور ان کا سیاسی اقتدار ملیامیٹ اور تباہ وبرباد ہو گیا، اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ مسلمان مسجدوں کی امامت کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں ایک امیر بھی منتخب کرتے۔ حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علماء کی جماعت میں وہ پہلے عالم تھے جنھوں نے وقت کی مناسبت کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کام کو شروع کیا، اس کی حمایت میں آواز بلند کی اور اگر تمام ہندوستان میں نہیں تو کم از کم ایک صوبہ میں اس کی تشکیل کی اور ہندوستان کے مسلمانوں کو بتایا کہ کفر کے تسلط اور غلبہ کے بعد مسلمانوں کی مذہبی زندگی پژمردہ ہے۔ مولانا محمد سجاد کی اس خالص مذہبی اور شرعی تحریک کی پوری قوت کے ساتھ اپنوں اور پرایوں نے مخالفت کی۔ ایک طرف حکومت متسلط نے اور دوسری طرف اس ملک کی بدقسمت اکثریت نے اس کو خطرے کی نگاہ سے دیکھا۔ سب سے زیادہ تعجب یہ ہے کہ ملک کے اس تعلیم یافتہ طبقہ نے جس کو آج کل سب سے زیادہ مسلمانوں کی نمائندگی کا شوق ہے اور جو مسلمانوں کی تہذیب اور کلچر کی حفاظت کا مدعی ہے اس نے بھی اس مذہبی تحریک کو اپنے اقتدار اور اپنی مزعومہ لیڈری کے خلاف سمجھا، جو حضرات غیر شرعی قوانین کے ماتحت زندگی بسر کرنے کے عادی ہو چکے تھے اور صرف نام کے مسلمان بن کر اسلامی قومیت کے حقوق کا بٹوارا کرانا جن کا مقصد زندگی ہو چکا تھا اور جو اسلامی احکام کی پابندی کو اپنی آزادی

ضمیر کے مخالف سمجھے ہوئے تھے، انھوں نے اس تحریک کو دقیانوسی اور تیرہ سو سالہ پرانی تحریک کہنا شروع کیا اور مولانا سجاد کی یہ کہہ کر مخالفت شروع کی کہ یہ ہم کو روشنی اور آزاد خیالی سے ہٹا کر پھر ملّا ازم پھیلانا چاہتے ہیں اور ہم کو مولویوں کے اقتدار کے ماتحت کرنا چاہتے ہیں، ان سب مخالفتوں سے زیادہ ان علماء کی مخالفت تھی، جن کا یہ فریضہ تھا اور قیام امارت جن کا شرعی اور قانونی فرض تھا۔ ان تمام مخالف قوتوں اور طاقتوں کی موجودگی میں مولانا محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ نے خدا کے بھروسہ پر اس کام کو شروع کیا۔

عزم اور ہمّت

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد میں جہاں بے شمار خداداد قابلیتیں موجود تھیں ان تمام خوبیوں اور قابلیتوں میں ان کی پختہ کامی، عزم بالجزم، مستقل مزاجی اور ہمت اور ارادے کی طاقت ضرب المثل ہے۔ وہ بڑی سے بڑی مشکل کا ان تمام قوتوں کے ساتھ مقابلہ کرتے تھے۔ وہ کام کرنے سے تھکتے نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان تمام طاغوتی قوتوں کا مقابلہ کرنے کے بعد ان کو کامیابی نصیب ہوئی۔ اگر علماء میں مداہنت منافست نہ ہوتی اور صوفیا میں ارباباً من دون اللہ بننے کا شوق نہ ہوتا تو آج تمام ہندوستان ایک امیر کے ماتحت شرعی زندگی بسر کر رہا ہوتا اور اسلام کی حقیقی برکات سے متمتع ہوتا اور ان کی روح حکومت برطانیہ کی غلامی سے آزاد ہوتی۔ اگرچہ جسم غلامی میں مقید ہوتا، لیکن پھر بھی اس جواں مرد سے جتنا ہو سکا اس نے کیا، وہ خدا کے سامنے اپنی نجات کا سامان مہیا کر کے لے گیا۔ اب دیکھنا ہے کہ ملک میں یہ سعادت کس کی قسمت میں لکھی ہے اور وہ کون شخص ہے جو مولانا مرحوم کی اس تحریک کو کامیاب بنانے میں سعی کرتا ہے، اور خدا کے سامنے سرخرو ہو کر جانا چاہتا ہے۔

کانگریس میں شرکت کی حمایت

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد مرحوم کا نظریہ ذکر کرتے ہوئے میں نے عرض کیا تھا کہ وہ موجودہ تسلط اور استبدادیت کو زیادہ سے زیادہ کمزور کرنے کی فکر میں تھے، ایک جانب ان کی توجہ تعمیر کی طرف مائل تھی اور زندگی کا دوسرا پہلو ان نظام حکومت کی تخریب پر منعطف تھا۔ ان کے سامنے ۱۸۵۷ء کی پوری تاریخ تھی۔ اسلامی حکومت کی تباہی، مسلمانوں کی بربادی کا تمام نقشہ ان کی آنکھوں میں تھا، پٹنہ کی وہابی تحریک اور اس کی ناکامی کا بھی ان کو علم تھا۔ سرحدی علاقہ میں حضرت شہید رحمۃ اللہ علیہ کی بچی کھچی جماعت کا جو حشر ہوا، اس کو وہ جانتے تھے، حضرت شیخ الہند رح کی آخری نہضت اور مولانا عبیداللہ سندھی کی جلاوطنی اور ریشمی رومال تحریک کا انجام بھی ان کو معلوم تھا۔ وہ ان تمام تحریکات کی ناکامی کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ اس ملک میں نظام حکومت کی تخریب تنہا مسلمانوں کے ہاتھوں سے نہیں ہو سکتی۔ نظام حکومت کی تخریب جب ہی ہو سکتی ہے جب دونوں قومیں مل کر اس کام کو کریں اور دونوں قوموں پر پورا پورا اشتراک عمل ہو۔ یہ رائے انھوں نے بہت سوچ سمجھ کر قائم کی تھی۔ انھوں نے الٰہ آباد یونیٹی کانفرنس میں ڈاکٹر منجے کی ایک تقریر کا جواب دیتے ہوئے صاف کہا تھا، جہاں تک ملک کی آزادی کا سوال ہے مسلمان کانگریس کے ساتھ شریک ہیں اور پوری قوت کے ساتھ کانگریس کی حمایت کرنے کو آمادہ ہیں لیکن جہاں تک مسلمانوں کی مذہبی اور شرعی زندگی ہے اور ان کے شخصی معاملات کا تعلق ہے وہ ایک امیر کے ماتحت ہی رہ سکتے ہیں اور ان کی شرعی زندگی بدون امیر کے نہیں رہ سکتی۔ یہی وہ بات تھی جو بار بار سمجھانے کے باوجود ڈاکٹر منجے کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ حضرت مولانا محمد سجّاد مرحوم کا یہ خیال تھا کہ

جب تک ہندو مسلمانوں کی جدوجہد کامیاب ہو اور ہندوستان میں نیشنل گورنمنٹ قائم ہو۔ اس وقت تک مسلمانوں کا اندرونی نظام اور ان کی شرعی تنظیم مکمل ہو جائے تاکہ نیشنل گورنمنٹ کے زمانے میں مسلمانوں کی معاشرت، ان کا کلچر، ان کی شوشل تہذیب، ان کے اوقاف، ان کے نکاح اور طلاق وغیرہ، ان کی زکوٰۃ اور ان کا عشر یہ تمام باتیں ایک شرعی امیر کے ماتحت ہوں اور ان تمام امور میں یہ ایک امیر کے ماتحت ہوں، اور اس شرعی تنظیم کو آئندہ ہندوستان کے دستور اساسی میں مسلمانوں کے ایک شرعی حق کی حیثیت سے تسلیم کرالیا جائے، تاکہ مسلمانوں کے اندرونی اور اصلاحی معاملات حکومت کی مداخلت سے محفوظ ہو جائیں۔ یہ ان کی اسکیم کا مختصر خلاصہ ہے جو میں نے عرض کیا۔ کاش اس مفید اور خالص مذہبی تحریک کو مسلمان سمجھتے!۔

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رحؒ کی بے شمار خدمات مذہبی و ملّی میں سے میں نے صرف ایک بات ذکر کی ہے اور وہ بھی وقت کی قلت اور اپنی عدیم الفرصتی کے باعث مضمون کو بہت ہی مختصر کر دیا ہے، ورنہ جمعیتہ علماء ہند کا قیام اور مسلم حقوق کے متعلق ان کے فارمولے اور تجاویز، کمیونل معاملات میں ان کی دور بینی، ہندو مسلم فسادات میں ان کی انتھک مساعی سے کون واقف نہیں ہے۔ ان کی زندگی میں صوبہ بہار فرقہ وارانہ فسادات میں کئی بار مبتلا ہوا۔ بتیا کے فساد کو زیادہ زمانہ نہیں گذرا لیکن مولانا نے اس فساد میں جو خدمت بتیا کے مسلمانوں کی انجام دی اس سے نہ صرف صوبہ بہار کے مسلمان ہی واقف ہیں بلکہ تمام ہندوستان کے مسلمان اس سے آشنا ہیں۔ قانون کی سمجھ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی صحیح عطا فرمائی تھی کہ وہ قانون کو خوب سمجھتے تھے۔ انڈیپنڈنٹ پارٹی کا قیام اسی آئین شناسی کا نتیجہ تھا انھوں نے قانون کو سمجھ کر بروقت پارٹی کی تشکیل کی اور الیکشن میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کی۔

آخری زمانہ میں جمعیۃ علماء ہند کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے، اور صرف دو دن میں انھوں نے جمعیۃ علماء کی بیس سالہ زندگی کی ایک مختصر تاریخ لکھ دی۔ حضرت مولانا سجاد ان تمام علمی اور عملی خوبیوں کے ساتھ انتظامی قابلیت ایسی رکھتے تھے کہ وہ اپنی آپ ہی نظیر تھے، ان کی صحیح سوانح لکھنے کے لیے دفتر کے دفتر چاہئیں۔ اس وقت ان کے متعلق جو کچھ لکھا گیا وہ سچ جانیے کہ سمندر میں سے ایک قطرے کی حیثیت بھی نہیں ہے۔ ان کا علم، ان کی ذہانت، ان کا تقویٰ، ان کی سمجھ اور سوجھ بوجھ، ان کی مستعدی اور کام کرنے کی قوت، ان کی غربت اور افلاس، ان کا صبر اور ان کا عزم، ان کے اخلاق کی بلندی اور ان کا کیرکٹر، خدا کا خوف اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت، مسلمانوں کی اصلاح کا شوق، ممالک اسلامیہ کی آزادی، اور ان کی بقا کا خیال، یہ سب باتیں وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں، جنھوں نے مولانا محمد سجاد کو قریب سے دیکھا ہے۔

مسلمان قوم کے سر پر سے ایک ایسے بزرگ کا سایہ اٹھ گیا جس کا بدل مستقبل قریب میں نظر نہیں آتا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَہٗ وَارْحَمْہُ۔

مولانا سجادؒ کی مذہبی اور سیاسی زندگی

از:- مولانا شاہ سید حسن آرزو صاحب

اسلامی تاریخ کا ابتدائی مدوّن ابن خلدون، خدا اسے معاف کرے علمائے اسلام کی نسبت رائے قائم کرنے میں جلدی کر گیا، ورنہ اگر آج کے دور قحط الرجال میں اور بالخصوص ایک غلام ملک میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحؒ، امیر الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد، مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ، شیخ الحدیث مولانا حسین احمد صاحب مدنی، نائب امیر شریعت ابوالمحاسن مولانا سجاد رحؒ جیسی شخصیتیں پیدا ہو سکتی ہیں تو کون کہہ سکتا ہے کہ تیسری اور چوتھی صدیوں میں ایسے باعمل سیاست داں علماء کی کمی رہی ہوگی، جن کا یابون عن السیاسة کہہ کر ابن خلدون نے ماتم کیا ہے۔ خدا کروڑوں رحمتیں نازل کرے مولانا سجاد کی روح پر! جن کی زندگی کے درمیانی دور کا مجھے ذاتی علم اور پچیس سالہ مشاہدہ ہوتا رہا۔ مولانا رحؒ سے میری ملاقات اس وقت کی ہے جب کہ خلافت اسلامیہ کے پرخچے اڑا دینے کا پروگرام مرتب ہو چکا تھا اور لوزان کانفرنس کے فیصلہ کا خطرہ مسلمانان ہند کے سامنے جلد ہی آنے والا تھا۔ اندرونِ ہند میں رولٹ ایکٹ جیسا سیاہ قانون فوراً ہی جاری ہونے والا تھا مسلمانان ہند الگ پریشان اور مضطرب اور مذہبی سیاست کے ہیجان میں مبتلا تھے اور ہندوستان کی

واحد نمائندہ جماعت کانگریس تقریباً نصف صدی کی بے عمل زندگیوں سے گھبرا کر کروٹ بدلنا چاہتی تھی، انھیں مقاصد کے پیش نظر حکیم الامت مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی مسلمانان ہند کے مخصوص اور با اثر صاحب فہم افراد کا ایک مذہبی اجتماع مسلم کانفرنس کے نام پر لکھنؤ میں کرنا چاہتے تھے، جس کی صدارت آنریبل بھوگری کو کرنی تھی۔ خوش قسمتی سے مجھے لکھنؤ کے اس سفر میں مولانا سجاد مرحوم کی معیت کا شرف حاصل ہوا۔ میں نے پہلی ہی ملاقات میں اس دُبلے پتلے نحیف و کمزور "عالم" دین سے مل کر یہ محسوس کیا کہ اس کے جسم کے اندر گوشت کا لوتھڑا نہیں دہکتی آگ کا شعلہ ہے۔ اس کی نظر کی گہرائی، اس کے دماغ کی بلندی اور فہم و فراست ارتقائے ملک کے لیے صاف اور سیدھا نظام عمل اپنے اندر مخفی رکھے ہوتے ہے۔ لکھنؤ کی وہ صحبت یقینی ایک تاریخی صحبت تھی۔ مخصوص مسلمانوں کا ایک بھرچا مجمع تھا اور کم از کم میری زندگی کا ایک تاریخی دن تھا۔ مجلس مضامین کی مخصوص صحبت میں پتہ چلا کہ مولانا سجاد کی ذہنی پہنچ کیا ہیں اور سیاسی معلومات میں وہ کس درجہ ماہر ہیں۔ لکھنؤ کے اسی صحبت میں سارے ہندوستان میں خلافت کمیٹیوں کے قیام کا مسئلہ طے کیا گیا اور لوگ مذہبی جوش و خروش کے ساتھ اپنے اپنے گھروں کو لوٹے۔ اپنے وطن لوٹنے کے بعد میرا دعویٰ[1] تھا کہ سب سے پہلے پھلواری خلافت کمیٹی قائم ہوئی اور مولانا رح فرماتے تھے کہ گیا خلافت کمیٹی قائم ہوئی اس کے

---

[1] واقعہ کی صحیح تصویر یہ ہے کہ سب سے پہلے خلافت کمیٹی بمبئی قائم ہوئی، جس میں حضرت مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محل لکھنؤ اور حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب رح کا ہاتھ تھا۔ مولانا سجاد صاحب رح جب بمبئی سے واپس ہوئے تو گیا میں خلافت کمیٹی قائم کی۔ اس کے بعد مولانا علیہ الرحمۃ پھلواری شریف تشریف لائے اور یہاں خلافت کمیٹی قائم کی گئی۔ (عبدالصمد رحمانی)۔

میراادر مولانا کا برابر جھگڑا رہا۔ ان خلافت کمیٹیوں نے مسلمانوں میں صحیح احساس اوران کی باہمی تنظیم میں کم ازکم جو کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ مسلمانان بہار ہی سے نہیں مسلمانان عالم سے مخفی نہیں۔ لیکن مولانا سجاد اسی پر بس نہیں کر سکتے تھے، وہ جو چیز ڈھونڈھتے تھے وہ خلافت کمیٹیوں میں بھی نہیں ملتی تھی۔ وہ جس منزل کے متجسس تھے وہاں تک پہنچنے میں سبھی کے پاؤں تھکتے تھے، لیکن "سجاد" اپنے مقصد میں تھکنا نہیں جانتے تھے، وہ اپنی آخری ساعت تک سعی پیہم سے باز نہ آئے۔ سختیاں جھیلیں، مصیبتیں برداشت کیں، جھڑکیاں سہیں غیروں سے نہیں اپنوں سے گالیاں کھائیں۔ دشنام سنے مگرارادہ اور مضبوط ارادہ کا یہ ہمالیہ ایک قدم بھی اپنے مقصد و مرکز سے ہٹنے کو تیار نہیں ہوا۔ ہندوستان کی آزادی جان سے زیادہ عزیز اوراس کے لیے سب کچھ نچھاور کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ کانگریس سے ملے اور ہراس جماعت سے سوالات کرنے کو بڑھے جس نے ہندوستان کی آزادی کو مطمح نظر تسلیم کیا لیکن اسی کے ساتھ وہ مسلمانان ہند کی ایک مخصوص زندگی کے طالب تھے۔ وہ مسلمانوں کو صورتاً اور سیرتاً صاف اور سچا مسلمان دیکھنا چاہتے تھے۔ سیاسی ہنگاموں کے ساتھ ساتھ وہ مذہبی اور شرعی زندگیوں کو ایک بار پھر لوٹانا چاہتے تھے۔ وہ کسی ایسے مسئلہ میں کسی کی رعایت نہیں کر سکتے تھے، جس کے اندر ذرا سا بھی مسلم مفاد کو ٹھیس لگ جانے کا شبہ بھی پیدا ہو۔ اگر وہ ایک طرف خود اپنی ایسی جماعت سے جنگ کرنے پر تیار رہتے تھے جس کے وجود سے ہندوستان کی آزادی کو خطرہ پیدا ہو سکتا تھا، تو ٹھیک اسی ساعت وہ کانگریس جیسی سیاسی اور ٹھوس آزادی کی طالب جماعت سے جنگ چھیڑ دیتے جہاں انھیں یہ محسوس ہوتا کہ اس کے عمل وحرکت سے مسلمان یا مذہبی مفاد کو نقصان پہنچنے کا خطرہ رونما ہو رہا ہے یا ہونے والا ہے۔ مجھے مولانا رحمہ سے مدتوں بعض امور، بعض مسائل میں سخت ترین اختلاف

رہا اور باوجود متعدد گفتگوؤں کے مولانا رح کی منطق میری سمجھ میں نہ آئی، لیکن ان کی نیک نیتی اور اپنے سے بہت زیادہ قابل اعتماد سیاست دانی پر بھروسہ کرتے ہوئے مولانا رح کی اس اجتہاد پر وقت کا انتظار کرتا رہا۔ مجھے اپنی شکست اور نافہمی کا اقرار ہے کہ مولانا جیتے اور میں ہارا۔

میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ مولانا رح آزادی کے ساتھ ساتھ مسلمانان ہند کو مذہبی مسلمان دیکھنا چاہتے تھے، اور بیسیوں قضیوں میں غیر مسلم فیصلوں کو ناجائز بتاتے تھے اور شرعی اسلامی زندگی کے لیے وہ لازمی اور واجب جانتے تھے کہ مسلمانان ہند کی زندگی شرعی طریقہ پر منظم زندگی ہو۔ اسی بنا پر انھوں نے علمائے ہند کے سامنے امیر الہند کی ایک شرعی تجویز رکھی جو بالآخر علماء کی جماعت میں قبول کی گئی، مگر حالات کی ناسازگاری سے اس پر عمل نہ ہو سکا، لیکن مولانا سجاد رح کی نظر میں یہ حقیقت تھی کہ اگر مرکز یا دوسرے صوبوں میں انھیں اختیار نہیں تو کم از کم اپنے ہی صوبہ میں بیج تو ڈال ہی دیں اور سارے ہندوستان کی نہ سہی بہار کے مسلمانوں کی شرعی زندگی کا سنگ بنیاد تو پڑ ہی جائے۔

آپ جانتے ہیں کہ ۱۳۳۹ھ میں مولانا سجاد رح کی سعی پیہم اور جان توڑ کوششوں نے امیر الہند مولانا ابو الکلام آزاد کے زیر سیادت بہار میں امیر شریعت کا انتخاب کرا ہی چھوڑا۔ مجلس استقبالیہ کے صدر مولانا شاہ حبیب الحق صاحب سجادہ خانقاہ عمادیہ منگل تالاب پٹنہ سیٹی تھے۔ بہار کے اس اسلامی تاریخی اجتماع نے حضرت مولانا شاہ محمد بدر الدین صاحب کو متفقہ طور پر اپنا امیر تسلیم کیا، اور مولانا سجاد رح نائب امیر۔ مجھے مولانا سجاد رح کی معیت میں اس خدمت کو انجام دینے کا بھی شرف حاصل ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ مولانا مرحوم کو اس وقت کن کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تھا، مگر ہمت و عمل کی اس مشین نے ساری دشواریوں سے

مقابلہ کرتے ہوئے آگے چلو! آگے بڑھو! کا نعرہ لگایا اور ہماری ہمتوں کو بلند اور کامیابی کو سامنے لاکھڑا کردیا۔ میں اور میرے دوسرے رفیق کا منہ تکتے ہی رہے اور مولانا رح کے سر کامیابی کا سہرا بندھ ہی گیا۔

خلافت کمیٹیوں کا اصلی کام بہادران ترک اور سمرنا کے مظلوم مسلمانوں کی مالی امداد ہی تھی۔ مولانا نے صوبہ اور مرکزی خلافت کمیٹی کی خدمت اس وقت تک جاری رکھی، جب تک انھیں دوسرے ذمہ دار کارکنوں کی طرح پوری مایوسی نہ ہوگئی۔ افسوس ہے کہ مرحوم سیٹھ چھوٹانی کے ساتھ ساتھ خود مرکزی خلافت کمیٹی کا جو حشر ہوا اس نے کم از کم دوسری خلافت کمیٹی کی کمر توڑدی۔ اور صدیوں بعد ہندوستان میں جو مسلم تنظیم ہوسکی تھی بدقسمتی سے اس کا شیرازہ ہی پھر ایسا بکھرا کہ آج تک سنبھل نہ سکا۔

اب مولانا مرحوم صرف ملکی آزادی اور مسلمانان ہند کی شرعی زندگی کی جانب متوجہ ہوگئے اور امارت بہار کا جو بنیادی خیال تھا اُسے عملی جامہ دینے کی تیاری شروع کردی۔ مولانا رح کو امارت اصول کو پھیلانے۔ مسلمانان بہار کو پوری طاقت کے ساتھ متوجہ کرنے میں طرح طرح کی مخالفت اور دشواریوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ مولانا رح کا صاف اور حقیقی نظریہ یہ تھا کہ مذہب اور سیاست مسلمانوں کے دونوں معاملات میں علمائے اسلام کو عموماً اور امارت بہار کو خصوصاً نہ صرف مداخلت کرنے کا حق ہے بلکہ اس کی نگرانی کا فرض انھیں پر عائد ہوتا ہے۔

مولانا رح کے اس نظریہ نے خصوصی حلقہ میں ہلچل ڈال دی اور انھوں نے اپنے ذاتی مفاد کو انتہائی خطرہ میں دیکھتے ہوئے نہ صرف مولانا بلکہ نفس امارت کی ہی مخالفت شروع کردی اور کچھ اس غیر معمولی قوت سے مخالفت شروع کی کہ بظاہر مولانا رح کو ان کا مقابلہ

دشوار نظر آنے لگا۔ بدقسمتی سے مخالفین کے اس گروہ میں دانستہ یا نادانستہ کچھ علماء بھی داخل ہوگئے، لیکن مولانا نے اس کی ذرہ برابر پروا کیے بغیر جس ہمت مردانہ سے مخالفوں کا مقابلہ کیا، وہ درحقیقت امارت بہار کی ایک سنہری تاریخ ہے۔ مخالفوں نے امیر بے طاقت کا مسئلہ اپنی دانست میں بہت ہی زور و شور سے اٹھایا تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ اس پردہ میں مولانا اور مولانا کی ساری اسکیم ہی کو مار لیں گے، اور ظاہر ہے کہ مسلمانوں کا انتشار اور ان کی پریشان حالی مخالفوں کی کامیابی کا سبب ہو سکتی تھی۔ حالاں کہ یہ کوئی بھی بڑا اور اہم مسئلہ نہ تھا، مگر مخالف ہماری پراگندگی اور انتشار کے پیش نظر اسی رائی کو پہاڑ بنا رہے تھے۔ تاہم اس دور میں امیر بے طاقت ہی کی ضرورت تھی۔ ظاہر ہے کہ بہار کی امارت نہ تو جہاد کی مدعی تھی، نہ سلطنت و خلافت کی۔ وہ مسلمانوں میں مذہبی تنظیم پیدا کر کے صرف سمع و طاعت کی عادت ڈال دینا چاہتی تھی، اور بالکل حقیقت ہے کہ اگر قوم و جماعت منظم طور پر صرف سمع و طاعت کی عادی ہو جائے تو نہ اسے تلوار کی ضرورت ہو، نہ تیر کی، کہ اس کا دوسرا نام قوت و طاقت ہے، جس کا تاریخی مظاہرہ بدر و حنین اور ابتدائے اسلام کے ہر ابتدائی دفاعی جنگوں میں ہوتا رہا تھا۔ ہاں خصومات باہمی میں دارالقضاء کے فیصلوں کی پابندی جزو لازم چیز تھی۔ ممکن ہے یہی مخالفوں کی خود ساختہ منطق چند منٹ مقابلہ میں آسکتی تھی لیکن اس کا صاف اور سیدھا جواب یہی ہو سکتا تھا کہ اگر تم امیر کو اپنا امیر تسلیم کرتے ہو اور اسی سمع و طاعت کے اصول پر اپنا دعویٰ دارالقضاء میں رجوع کرتے ہو تو انفصال قضیہ کے بعد نفاذ فیصلہ میں کوئی بھی دشواری کا امکانی پہلو نظر نہیں آسکتا۔ اطاعت امیر کی صحیح تعریف تو یہی ہو سکتی تھی کہ اس کے شرعی حکم پر کوئی روگردانی نہ کی جائے۔

جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں۔ مولانا مسلمانوں کے مذہب و سیاست کی

باگ علما، اور بالخصوص امارت کے مضبوط ہاتھوں میں دیکھنا چاہتے تھے۔ اس کی پہلی اسمبلی اور کانسل کی گذشتہ انتخابات میں انھوں نے کر بھی دی۔ گو امارت کھلے کھلے نہ تو سامنے آئی اور نہ انتخاب کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ مگر یہ کام جس جماعت کے حوالہ کیا گیا، وہ درحقیقت امارت بہار کی ایک اہم با اعتماد اور ذمہ دار جماعت تھی۔ مولانا سجادؒ اس کے اصلی روح، سردار اور مشیر اعلیٰ تھے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اس ہمت مردانہ کے جرم میں مولانا مخالفوں اور دشمنوں کے ہجوم میں گھرے ہوئے تھے اور یقینی وہ وقت بہت ہی نازک تھا کہ غیروں کے بجائے اس اصولی جنگ میں انھیں اپنوں سے مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا، لیکن اسلام کا یہ شیدائی اپنوں سے بھی بے نیاز و بے پرواہ ہو کر اصولی جنگ چھیڑ چکا تھا، اور کامیابی اس کا قدم لینے کے لیے بے چین و مضطرب وقت کا انتظار کر رہی تھی۔ قدرت نے بھی اس کی آبرو رکھی اور دنیا نے دیکھ لیا کہ بہار اسمبلی میں کانگریس کی مجموعی اکثریت کے بعد امارت اور مولانا سجاد کی ہی پارٹی غالب تھی۔ مولانا سجادؒ وقت کو ضائع کرنا بدترین گناہ جانتے تھے، ان کا کوئی منٹ بھی کام سے خالی نہیں جاتا۔ کچھ نہیں تو دوسروں کے ساتھ بیٹھے ہوئے اخبار کے بنڈل ہی باندھ رہے ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ وہ راتوں کی نیند میں بھی صبح کے کاموں کا پروگرام ہی مرتب کرتے ہوں گے۔ مولاناؒ کے سیاسی تبحر کا آپ کو اسی سے اندازہ ہو جائے گا کہ جب مولانا شفیع داؤدی اور ہمارے مولانا سجاد کے درمیان خاص حالات کی بنا پر اختلاف اور اختلاف نے جنگ کی صورت پیدا کر دی تو پٹنہ کے کچھ مخلص نے باہمی مصالحت کی ایک اچھی صورت نکالنی چاہی اور دونوں کو ایک جگہ دعوت دی گئی اور بات یہ طے پائی کہ دونوں باہمی اصولی گفتگو کر کے ایک متفقہ راہ مسلمانوں کے لیے نکال لیں مجمع بہت ہی اچھا خاصہ، سمجھدار اور تعلیم یافتوں کا تھا۔ جس کے روح رواں ڈاکٹر سید عبدالحفیظ فردوسی

تھے۔ ان کے درمیان ابتدائی گفتگو شروع ہوئی۔ جس کا سلسلہ اتنا دراز ہوا کہ ساری رات ختم ہوگئی اور صبح کی نماز کے بعد مجمع منتشر ہوسکا۔ پھر بھی بات ناتمام رہی۔ مولانا شفیع داؤدی کا پروگرام لاہور جانے کا تھا۔ اسی سلسلہ میں ممالک عالم کے سیاسی اور نظامی دستورات پر گفتگو نکل پڑی۔ مولانا شفیع داؤدی بول رہے تھے کہ مولانا نے ٹوکا اور اس کے بعد جو انھوں نے بیان کرنا شروع کیا کہ انگلینڈ کا دستور حکومت یہ ہے۔ فرانس کا یہ ہے۔ جرمنی کا یہ ہے۔ اٹلی کا یہ ہے۔ روس کا یہ ہے۔ امریکہ کا یہ ہے۔ آئرلینڈ کا یہ ہے۔ ٹرکی وایران کا یہ ہے۔ تو سارا مجمع حیرت واستعجاب سے مولانا کو تک رہا تھا اور وہ نہایت ہی جوش کے ساتھ کانسٹی ٹیوشن بیان کرتے چلے جا رہے تھے۔ بالآخر مولانا شفیع داؤدی کو یہ تسلیم کرنا ہی پڑا کہ مولانا نہ صرف مذہبی عالم متبحر ہیں بلکہ دنیا کی سیاست اور اس کے دستور و نظام حکومت کے بھی عالم متبحر ہیں۔ مولانا ہر اختلاف میں اصولی اختلاف کرنے کے عادی تھے اور اختلاف کو اختلاف ہی کی حد تک قائم رکھنا جانتے تھے۔ نہرو رپورٹ جب سامنے آئی تو مولانا نے اس سے اصولی اختلاف شروع کیا اور آخری وقت تک پوری قوت کے ساتھ اختلاف کرتے رہے۔ اسی طرح نئی اصلاحات ملکی سے انھوں نے پوری طاقت کے ساتھ اختلاف کیا۔ وہ جدید نظام حکومت میں بالخصوص مسلم مفاد کا سخت ترین گھاٹا اور نقصان سمجھتے تھے، اور بار ہا فرماتے رہے کہ اس سے تو بعض حیثیت سے نہرو رپورٹ ہی بہتر چیز تھی۔ واردھا اسکیم میں چوں کہ مذہبی تعلیم سے بے اعتنائی کا کافی پہلو نظر آتا تھا۔ مولانا نے شروع ہی میں اس کی مخالفت کی۔ اسی طرح شاردھا ایکٹ جب سامنے آئی تو چوں کہ اس کا تعلق ٹھیک ہندؤں کی طرح مسلمانوں سے بھی تھا، اسی لیے اس کی پوری کوشش شروع کردی کہ مسلمان بہرحال اس قانون سے الگ کردیئے جائیں کیوں کہ یہ قانون شرعی قانون سے آگے چل کر یقینی متصادم ہوگا۔ میں اوپر بھی عرض

کر چکا ہوں کہ مولانا آزادی ہند کی حیثیت سے کانگریس کے گرم جوشی سے ممد و معاون اور شریک کار تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مفاد اسلامی کے خطرہ کے موقع پر وہ کانگریس کے سخت ترین دشمن و مخالف بھی تھے۔ ہمارے صوبہ کی گذشتہ قومی حکومت سے اس لیے جنگ کر گئے کہ وہ جبریہ تعلیم کے اسکیم میں خصوصیت کے ساتھ مذہبی تعلیم کو کوئی جگہ دینا نہیں چاہتی تھی لیکن اس شدید مخالفت کے باوجود ذمہ داران کانگریس مولاناؒ کو ایک بے غرض محب قوم و وطن سمجھتے ہوئے انتہائی عزت و احترام سے پیش آتے رہے۔

مولاناؒ صبر و تحمل کے بھی ایک پہاڑ تھے۔ میں نے تقریباً پچیس سال کی مدت میں بجز ایک موقع کے کبھی کسی سخت گو کا جواب سختی کے ساتھ دیتے نہ سُنا۔ شریر اخبار نویس اور دوسرے خود غرضوں نے مولانا کو گندی اور غلیظ گالیاں دیں۔ حالات و واقعات سے نا آشنا لوگوں نے مولانا پر اعتراض کے تیر برسائے۔ بدمعاشوں نے اتہامات تراشے، ہجوئیں لکھیں۔ لیکن مولانا خوش سب دیکھتے اور سنتے رہے۔ مولانا کے عقیدت مندوں میں کچھ صاحب قلم بھی تھے۔ مگر مولانا نے انھیں سختی کے ساتھ روک رکھا تھا۔ بالعموم سیاسیین اور خادمان وطن کی خانگی زندگیاں تنگی و عسرت کی زندگی ہوا کرتی ہے۔ مولانا کو ابتدا ہی سے اس سے واسطہ پڑا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ اس سلسلہ میں مولانا کی زندگی بے حد صبر آزما تھی۔ اس کے باوجود مجھے ذاتی علم ہے کہ وہ دوسروں کی بھوک کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اپنے لیے وہ انتہائی غیور تھے۔ لیکن دوسروں کے لیے وہ قرض لینا بھی معیوب نہیں جانتے تھے۔

لکھنے اور بیان کرنے کی لاکھوں باتیں ہیں۔ مگر کہاں تک لکھوں۔ مولانا کا بڑا لڑکا خدا اسے جنت نصیب کرے، دیوبند کا تعلیم یافتہ اور فارغ التحصیل تھا۔ ۱۹۳۰ء کے سیاسی ہنگامے سول نافرمانی کے سلسلہ میں اسے بھی ۶ ماہ کی جیل ہو گئی۔ مدت تمام کرنے کے بعد جب مکان آیا تو

اس پر کچھ دنوں بعد ہی نمونیہ کا حملہ پڑا اور سخت حملہ۔ مولانا تبلیغی ضرورتوں کے سلسلہ میں چپارن کا دورہ فرما رہے تھے، یہاں سے تار پر تار گیا، لیکن مولانا اس وقت مکان پہنچے تقریباً لڑکا مر چکا تھا۔ مولانا رح کے آنے کے دو تین دن بعد لڑکے کا انتقال ہوگیا۔ مولانا کے پاس کچھ زمین ایسی بھی تھی جس پر لگان دوسرے زمیندار کو دینا پڑتا تھا۔ اتفاقاً زمینداروں نے ڈگری کرا کر آپ کی زمین نیلام کرانی چاہی۔ لوگوں نے مولانا کو اطلاع دی۔ مولانا رح نے ہنس کر فرمایا جانے بھی دو۔ اس کا بھی تعلق لگا ہی رہتا ہے، وہ بھی ختم ہو جائے تو اللہ کے بندوں کی خدمتوں میں پوری یکسوئی حاصل ہو۔

سچ ہے۔ جن کے رتبے ہیں سوا۔ ان کو سوا مشکل ہے۔ اللہ اکبر مولانا علیہ الرحمۃ ایمان و صداقت کی راہ میں جتنا جھنجھوڑے گئے اور آزمائش میں ڈالے اور بار بار ڈالے گئے۔ اتنے ہی کھرے ثابت ہوئے، جس کی مثال اس دور میں مل ہی نہیں سکتی ہے۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ۔

حضرت مولانا محمد سجادؒ
اور
خدماتِ امارت

از:۔۔۔۔۔ مولانا سید محمد عثمان غنی صاحبؒ سابق ناظم
امارت شرعیہ صوبہ بہار

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحبؒ کو مسلم ہندوستان ایک عالم دین، سیاست داں اور مفکر کی حیثیت سے جانتا ہے۔ بلا شبہ حضرت مولانا ان اوصاف سے متصف تھے لیکن ان کے ساتھ ان کا سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ وہ کلمۃ اللہ کا اعلاء، شریعت اسلامیہ کی رفعت، اصولِ اسلام کا اجراء، اور حکومتِ اسلامیہ کے قیام کی سعی کا جذبۂ کامل رکھتے تھے اور اس کے لیے جدوجہد میں ہمیشہ مصروف رہتے تھے اور اس حیثیت سے ان کا درجہ اپنے تمام معاصرین سے بہت بلند ہے۔

قوانین اسلام کے اعلاء اور حکومت شرعیہ کا قیام ہی ان کی تمام قومی و سیاسی امور میں شرکت کی بنیاد ہے۔

امارت شرعیہ کے قیام پر غور و فکر، اس کے لیے سعی و جہد، اس کی بنیاد اور اس کے تمام کاموں کی اصل روح حکومت شرعیہ کے لیے راہ کی صفائی اور ہمواری ہے۔

سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے وقت جب کہ ہندوستان کا بڑا طبقہ برطانیہ کی امداد و اعانت میں مصروف تھا، حضرت مولانا ہندوستان کی برتری کے لیے ایک ایسی روشنی کی تلاش میں تھے جو شریعت اسلامیہ سے حاصل کی گئی ہو، چنانچہ کتاب و سنت سے یہ روشنی مل گئی۔

حضرت مولانا رح سے جن علماء کے تعلقات تھے ان سے گفتگو کر کے ان کو ہم خیال بنایا

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد اسی زمانہ میں رانچی میں نظر بند تھے، ان سے برادرم شاہ محمد قاسم صاحب عثمانی نے حضرت مولانا سجاد اور ان کی "شرعی اسکیم" کا تذکرہ کیا تو انھوں نے ملنے کی خواہش کی۔ چنانچہ حضرت مولانا، اخی محترم قاضی سید احمد حسین صاحب اور برادرم شاہ محمد قاسم صاحب کی معیت میں رانچی تشریف لے گئے، اور حضرت مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات کی۔ یہ ملاقات بالکل تخلیہ میں ہوئی جس میں حضرت مولانا نے امارت شرعیہ کے متعلق فقہی حوالہ دکھائے۔ اس ملاقات و گفتگو کے بعد حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے اس شرعی اسکیم سے اتفاق کا اظہار فرمایا۔ حضرت مولانا عبدالباری لکھنوی فرنگی محلی سے بھی اسی سلسلہ میں تعلقات پیدا ہوئے۔

جنگ عظیم کے نتیجہ میں جب زوال خلافت کی نوبت آئی اور برطانیہ نے اپنے اعلانوں کی خلاف ورزی کی اور مسلمانوں کے مطالبات و احتجاجات بے اثر رہے تو مسٹر مشیر حسن قدوائی مرحوم نے انگلستان سے مولانا عبدالباری مرحوم کو لکھا کہ اگر ہندوستان میں خلافت کمیٹی کے نام سے کوئی انجمن قائم کی جائے اور اس کے ذریعہ وسیع پیمانہ پر برطانیہ کے رویہ پر احتجاج کیا جائے تو برطانیہ کے متاثر ہونے کی امید ہے۔ مولانا عبدالباری صاحب نے حضرت مولانا رح سے مشورہ طلب کیا اور خلافت کے نام سے لکھنؤ میں پہلا جلسہ ہوا۔ خلافت کمیٹی کی پہلی بنیاد بمبئی میں رکھی گئی۔ واپس آکر مولانا رح نے گیا میں خلافت کمیٹی کی بنیاد رکھی، پھر پھلواری شریف اور صوبہ بہار کے دوسرے مقامات میں خلافت کمیٹیاں قائم کیں۔

تمام ہندوستان میں ایک انقلاب ہو رہا تھا اور اسی انقلاب میں حضرت مولانا بھی نمایاں حصہ لے رہے تھے۔

جمیعۃ علماء ہند نے ترک موالات کا جو فتویٰ شائع کیا اس کے مصنف حضرت مولانا ہی تھے اور اس فتوے کا ہندوستان میں جیسا کچھ اثر ہوا اس سے اس زمانہ کو دیکھنے والے اچھی طرح واقف ہیں۔

اس تمام سعی وجہد کے ساتھ حضرت مولانا امارت شرعیہ کے قیام کی سعی فرماتے رہے۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحبؒ جب مالٹا کی اسارت سے ہندوستان واپس آئے تو حضرت مولانا دیوبند جاکر ملے اور شیخ الہندؒ سے امارت شرعیہ کے متعلق گفتگو فرمائی۔ حضرت شیخ الہندؒ نے اس کو پسند فرمایا۔ لیکن اس تمام سعی وکوشش اور تمام علماء ہند کی رضا وہم خیالی کے باوجود بعض ایسے اسباب پیش آئے کہ امیر الہند کا انتخاب نہ ہوسکا تب حضرت مولاناؒ نے صوبہ بہار میں ہی پہلے امارت شرعیہ کے قیام کی سعی کی اور جمیعۃ علماء صوبہ بہار کے غیر معمولی اجلاس پٹنہ میں ۱۹، ۲۰ر شوال ۱۳۳۹ھ کو حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں منعقد ہوا۔

صوبہ بہار کے علماء اور دوسرے اصحاب حل وعقد نے باتفاق رائے حضرت مولانا شاہ محمد بدرالدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سجادہ نشیں خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کو امیر شریعت اور حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو نائب امیر شریعت منتخب کیا اور ۹ر اصحاب کی مجلس شوریٰ بنائی، جس میں اس وقت حسب ذیل حضرات منتخب کیے گئے۔

حضرت مولانا شاہ محمد محی الدین صاحب (موجودہ امیر) حضرت مولانا عبدالوہاب صاحب دربھنگہ، حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی، حضرت مولانا شاہ محمد نورالحسن صاحب پھلواروی، حضرت مولانا عبدالاحد صاحب، حضرت مولانا فرخند علی صاحب مرحوم، حضرت

مولانا کفایت حسین صاحب مرحوم، حضرت مولانا زین العابدین صاحب ڈھاکہ اور راقم الحروف
محمد عثمان غنی۔

جمعیۃ علما بہار کا جلسہ ختم ہونے کے بعد میں اپنے مکان دیورہ چلا آیا، چند روز کے بعد
حضرت مولانا نے مجھ کو گیا بلایا اور وہاں سے میں حضرت مولانا کے ساتھ پھلواری شریف آیا اور
۹ ذی قعدہ ۱۳۳۹ھ کو دفتر امارت شرعیہ قائم کر کے ارکان مجلس شوریٰ کو دعوتی خط لکھا گیا۔

حضرت مولانا رح کی تحریک پر مجلس شوریٰ نے راقم الحروف کو ناظم امارت شرعیہ مقرر کیا،
اور صوبہ میں بیعت امارت کے لیے ایک وفد کی تجویز مرتب کی۔ جمعیۃ علما بہار نے کچھ ماہ قبل
اپنی ایک تجویز کے ذریعہ بیت المال اور دارالقضا، قائم کیا تھا۔ قیام امارت کے بعد مجلس شوریٰ
نے بیت المال اور دارالقضا، کو امیر شریعت کی نگرانی میں لے لیا۔

ناظم بیت المال حضرت مولانا شاہ محمد نور الحسن صاحب مقرر کیے گئے اور دارالقضا،
کے لیے قاضی۔

دفتر امارت شرعیہ اور بیت المال کے قیام کے بعد محررین، مبلغین، عمال اور محتسب
مقرر کیے گئے۔

وفد امارت نے صوبہ میں دورہ کر کے امارت شرعیہ کی ضرورت واہمیت کی اشاعت
کی تبلیغ و اصلاح کے فرائض انجام دیئے اور مسلمانوں سے امیر شریعت کی سمع وطاعت
کی بیعت لی۔

وفد امارت کے دوروں میں خود حضرت نائب امیر شریعت شریک رہتے
اور وفد کا دورہ سال کے اکثر حصوں میں برابر ہوتا تھا۔

مسلمانوں کو وفد کے دورہ سے جس میں خود حضرت مولانا شریک رہتے، دینی و دنیوی

فائدے حاصل ہوتے تھے، مذہبی باتیں معلوم ہوتی تھیں۔ دینی معلومات میں اضافہ ہوتا تھا، مراسم قبیحہ اور عقائد فاسدہ کا ازالہ فرماتے تھے، لوگوں کے باہمی جھگڑوں کو طے کر کے ان کو باہم ملا دیتے تھے۔ اس سے لوگ باہمی بغض و خصومت سے بچتے اور اخراجات کی زیر باری سے محفوظ ہو جاتے تھے۔

تحریک خلافت کے زوال کے بعد ملک میں جو فتنہ و فساد پھیلا اور شدھی سنگٹھن کی تحریک شروع ہوئی اور ملک مختلف حصوں میں ارتداد کی وبا پھیل گئی اس کے روکنے میں حضرت مولانا نے امارت شرعیہ کے کارکنوں سے کام لینے کے علاوہ خود بھی حصہ لیا۔ ملکانہ میں خود دورہ کر کے تبلیغی کام انجام دیئے۔ امارت کے متعدد مبلغین کو وہاں متعین کر کے ان سے دفع ارتداد اور تبلیغ و اصلاح کا کام انجام دلایا۔

صوبہ بہار کی گدیوں اور بھانٹوں میں جب ارتداد کی وبا پھیلی تو ضلع چمپارن میں گدیوں کی اصلاح کے لیے اور ضلع سارن میں بھانٹوں کی اصلاح کے لیے خود بھی دورہ کیا۔ چوں کہ گورکھپور کی طرف سے ان اضلاع میں ارتداد کے جراثیم آتے تھے، اس سرچشمہ کو بند کرنے کے لیے حضرت مولانا نے گورکھپور کے علاقہ کا دورہ فرمایا اور اصلاحی و تبلیغی جلسے کر کے اور متاثر شدہ افراد کی نفسیات کا لحاظ رکھ کر اصلاحی رسائل شائع فرمائے۔ اس طرح ارتداد کی یہ وبا حضرت مولانا کی سعی جمیل سے اس صوبہ سے ختم ہو گئی اور ان لوگوں کی آئندہ حفاظت اور تعلیم کے لیے متعدد علاقوں میں مسجد تعمیر کرا دی اور اس طرح ہزاروں مسلمان کفر کی آغوش میں جانے اور جہنم کے ایندھن بننے سے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئے۔

فتنۂ راجپال کے انسداد کے لیے صوبہ کے مختلف مقامات میں جلسے کرائے۔

راج پال ایک آریہ تھا جس نے "رنگیلا رسول" نامی ایک ناپاک کتاب لکھی تھی اور حکومت

پنجاب نے اس پر مقدمہ چلایا تو ہائی کورٹ سے وہ رہا ہو گیا۔ اس واقعہ سے تمام مسلمانانِ ہند میں ایک ہیجان پیدا ہوا، اور خطرہ ہوا کہ مفسد اور شریر افراد اسی طرح اپنے خبثِ نفس کا اظہار کرتے رہیں گے۔ اس بنا پر تمام ہندوستان میں احتجاجی جلسے ہوئے اور حکومت ہند سے قانون میں ترمیم کا مطالبہ کیا گیا۔

ایک مسلمان نے راجپال کو قتل کر دیا اور حکومتِ ہند نے قانون میں ایسی ترمیم کر دی کہ پھر اس طرح کی کوئی کتاب شائع نہ کی جائے۔

صوبہ میں جتنے فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ان میں جہاں کہیں مسلمانوں کی مظلومیت ثابت ہوئی، حضرت مولانا رح نے امارت شرعیہ کی جانب سے مظلومین کی مناسب اعانت کی۔ بتیا کے فساد کے موقع پر وہاں مہینوں قیام کر کے مسلمانوں کے مقدموں کی پیروی کرائی، اور حضرت مولانا کے اثر اور امارت شرعیہ کے تعلق سے بڑے قانون دانوں نے کام کیا۔ بتیا کے مسلمانوں کو ہزاروں روپیہ تاوان دلائے۔

اضلاع دربھنگہ و مظفر پور کے بعض دیہاتوں میں بقرعید کے موقع پر فسادات ہوئے جن میں مسلمانوں کو قتل کیا گیا اور لوٹا گیا۔ وہاں بھی حضرت مولانا خود تشریف لے گئے اور امارت شرعیہ کے کارکنوں کے ذریعہ مقدمہ میں اعانت کی۔ صوبہ کے دوسرے مقامات کے فسادات میں بھی مسلمانوں کی اعانت کی گئی۔

کانگریسی حکومت کے زمانہ میں جو فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اس کی خود تحقیقات کی یا امارت شرعیہ کے کارکنوں کے ذریعہ تحقیقات کرائی اور مظلوم مسلمانوں کی مالی یا قانونی امداد کرائی۔

نیا گاؤں ضلع مظفر پور کے فساد میں مظلوم مسلمانوں کے لیے پٹنہ کے ایک مشہور بیرسٹر

کو حکومت کی طرف سے مقرر کرایا، جنھوں نے سشن اور ہائی کورٹ میں بھی کام کیا۔

گیا کے فساد کی تحقیقات کے لیے راقم الحروف کو بھیجا، اور پھر ایک دو روز کے لیے خود تشریف لے کر مفید مشورے دیئے اور سعی و کوشش کر کے مسلمانوں کو تاوان دلایا۔

متعدد دیہاتوں میں بقرعید کے موقع پر مسلمانوں کو قربانی سے دفعہ ۱۴۴ کے ذریعہ روکا گیا، جس جگہ کے مسلمانوں نے بروقت اطلاع دی۔ ان کو یہ مشورہ دیا کہ قربانی کرو اور لکھ کر درخواست دے دو کہ ہم نے قربانی کی۔ چنانچہ جس جگہ مسلمانوں نے ایسا کیا وہاں چند سال کے بعد وہ اطمینان سے قربانی کرنے لگے ہیں۔

میں نے عرض کیا ہے کہ حضرت مولانا کا مقصد وحید اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے شریعت اسلامیہ کی حکومت کا قیام تھا اور امارت شرعیہ اس کا ایک زینہ ہے جس کے ذریعہ مسلمانوں کی تنظیم اور ان میں وحدت ملی اور عادت سمع و طاعت پیدا کی جا سکے۔ غلاموں اور محکوموں کے لیے اعلاء کلمۃ اللہ دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

ہم برابر دیکھتے ہیں کہ کرفیو آرڈر کے وقت عشا، اور فجر کی نماز ہم جماعت سے نہیں پڑھ سکتے۔ ہم ہر جگہ اپنے گھروں میں قربانی گاؤ نہیں کر سکتے۔

نکاح و طلاق کے معاملات میں بھی ہم قانون شریعت پر عمل کرنے سے معذور رہتے ہیں۔

ہماری مسجدیں ویران ہو رہی ہیں، ہمارے اوقاف برباد ہو رہے ہیں، لیکن ہم اپنے قانون شریعت کے مطابق ان کی اصلاح کرنے سے معذور ہیں۔

عام لوگوں کو تو کوئی احساس ہی نہیں جب وہ خود مذہب کا استخفاف کرتے ہوئے نہیں شرماتے اور اعلانیہ نماز جیسے فریضہ کو ترک کرتے ہیں تو ان سے اس کی کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ دوسروں کے استخفاف دین پر کسی جذبۂ ایمانی کا اظہار کریں گے۔

جن مذہبی افراد کو احساس ہے وہ اپنے خیال کے مطابق اس صورت حال کو بدلنے کی مختلف راہیں تلاش کرتے ہیں اور کسی ایک راہ پر ہو لیتے ہیں خواہ اس راہ سے وہ حجاز کی بجائے وار دھا یا بمبئی تک پہنچ کر رہ جائیں یا پھر روس جا پہنچیں۔ لیکن حضرت مولانا نے ایک سیدھی اور صاف راہ اختیار کی۔ جو شریعت اسلامیہ کی طرف لے جانے والی ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں جو کچھ کیا وہ صرف اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے کیا، اسلام اور اس کے قوانین کی برتری کے لیے کیا۔

حضرت مولانا کو جن لوگوں نے سیاسی مجالس میں دیکھا ہے، خواہ وہ مجلس خالص مسلمانوں کی ہو یا مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کی مشترک ہو، جب موقع ہوا تو انھوں نے کسی نہ کسی اسلامی مقصد کو پیش کر دیا۔ اس مقصد کو پیش کرتے ہوئے کبھی وہ لومۃ لائم کی پرواہ نہیں کرتے تھے، وہ فرقہ پرور اور تاریک خیال ملا کہے جانے سے نہیں ڈرتے تھے۔

اسمبلی اور کونسل میں جب بھی کوئی ایسا مسودہ قانون آیا جس کا کوئی اثر کسی اسلامی معاملہ پر پڑتا ہو تو سب سے پہلے اس کی مخالفت فرماتے تھے۔

راقم الحروف کو خاص تاکید تھی کہ جب کوئی مسودۂ قانون یا کسی عدالت کا فیصلہ ایسا ہو جس کی زد کسی اسلامی قانون پر پڑتی ہو تو فوراً اس کی مخالفت میں مضامین لکھو، اور جمعیۃ علماء ہند کو خط کے ذریعہ اطلاع دو۔

جب قانون نکاح نابالغان مرکزی اسمبلی سے پاس ہوا تو اس کی مخالفت شدت کے ساتھ فرمائی۔

جمعیۃ علماء ہند نے اس قانون کی مخالفت میں اپنا ایک خاص جلسہ کیا اور تمام ہندوستان میں اس قانون کی مخالفت میں جلسے کرائے۔ اس مخالفت کا سبب بھی یہی تھا کہ اسلام نے نکاح

کے لیے عمر مقرر نہیں کی ہے۔ ہر عمر کے نکاح کو جائز قرار دیا ہے اور یہ قانون اس کو ممنوع قرار دیتا ہے اور یہ اسلامی معاملات میں مداخلت ہے۔

قانون نکاح نابالغان پاس ہو جانے کے بعد جمعیۃ علماء ہند نے آئندہ کے خطرات کے انسداد کے لیے "مجلس تحفظ ناموس شریعت" قائم کی۔ اس کی نظامت جب حضرت مولاناؒ کے سپرد ہوئی تو انھوں نے منجملہ دوسرے کاموں کے دہلی سے مساجد اور اوقاف کی واگذاری کی تحریک بھی شروع کی۔ یہ وہ مساجد اوقاف تھیں جو حکومتِ ہند یا صوبوں کی حکومتوں کے قبضہ میں ہیں۔

مساجد اوقاف کے متعلق مرکزی اسمبلی میں سوال کرایا تو جواب سے معلوم ہوا کہ حکومتِ ہند کے قبضہ میں تقریباً پانچ سو مساجد ہیں۔ اوقاف کے متعلق کوئی جواب نہیں ملا یا شاید سوال ہی نہیں ہوا، اس وقت یاد نہیں۔ یہ تحریک بھی اسی دینی جرأت پر مبنی تھی، جو حضرت مولانا کا خاص حصہ تھا۔ اور پھر یہ کہ مسلمانوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ ان کی مذہبی چیزیں حکومتِ ہند کے قبضہ میں ہیں اور ان میں اس کی واپسی کا جذبہ پیدا ہو اور تحریک کی کامیابی کی صورت میں مسلمانوں کو اپنے ایک فرض سے سبک دوشی بھی حاصل ہو جائے۔

مجالس مقننہ میں جو قوانین منظور ہوتے ہیں وہ ہم پر نافذ ہی ہو جاتے ہیں خواہ ہم کو کتنے ہی ناپسند ہوں۔

مسلمانوں کو معلوم ہے کہ جمعیۃ علماء ہند نے ترکِ موالات کے سلسلہ میں مجالس مقننہ کا بھی مقاطعہ کیا تھا لیکن انتخاب کے موقع پر مسلمانوں کی نشستوں سے مسلمان کھڑے ہوتے تھے اور منتخب ہو کر مجالس مقننہ میں جاتے تھے اور بعض لوگ وہاں پہنچ کر صرف اپنے مفاد کے پیش نظر کام کرتے تھے دینی اور جماعتی مفاد کو فراموش کر جاتے تھے، صوبہ کی کونسل اور مرکزی اسمبلی میں ایسے بہت سے واقعات پیش آئے۔

راقم الحروف نے حضرت مولانا رح سے عرض کیا کہ مجالس مقننہ کے ارکان جس طرح منتخب ہو کر جاتے ہیں وہ دین و ملت اور ملک و قوم کے لیے سخت نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں اس لیے مسلم ارکان پر آئندہ پابندی عائد کی جانی چاہیے۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ جب تک جمعیۃ علماء ہند مقاطعہ کی تجویز کو واپس نہ لے لے، اس وقت تک ہم کسی کی تائید یا حمایت کر سکتے ہیں۔

میں نے عرض کیا کہ مجالس مقننہ کے ارکان کی جو روش ہے اس کو دیکھتے ہوئے مقاطعہ کو قائم رکھنا جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ (اذا ابتلی ببلیتین فاختر اھونھما) پر عمل کرنا چاہیے۔ مثال میں ہم نے قاضی احمد حسین صاحب کے وقف بل کی ناکامی کو بیان کیا کہ صرف مسلمان ارکان کی حکومت پرستی نے اس مفید بل کو ناکامیاب کیا۔ نیز مرکزی اسمبلی کے بعض ارکان جیسی حرکت کر رہے تھے اس کو عرض کیا۔

حضرت مولانا نے فرمایا کہ تم جریدہ امارت میں لکھو اگر جمعیۃ علماء ہند اپنی عائد کردہ پابندی ہٹا لے تو پھر آئندہ حصہ لیا جائے۔ چنانچہ راقم الحروف نے جریدۂ امارت میں مضامین لکھنا شروع کر دیئے۔ اس کے بعد نقیب میں بھی کچھ مضامین لکھے۔

حضرت مولانا کی عادت تھی کہ جس معاملہ میں ان کا قلب مطمئن ہو جاتا تھا پھر اس کو جلد سے جلد انجام دینے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ اس معاملہ میں بھی جب ان کا قلب مطمئن ہو گیا کہ مجالس مقننہ کے انتخاب میں ہمارے حصہ لینے سے کسی حد تک دینی فائدہ کی توقع ہے اور امارت شرعیہ کے مقاصد کے لیے ہماری شرکت مفید ہو سکتی ہے تو انھوں نے جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ (غالباً منعقدہ مراد آباد ۱۹۳۴ء میں) مجالس مقننہ میں حصہ لینے کی تجویز پیش کر دی جو منظور ہو گئی۔

اس کے بعد ربیع الاول ۱۳۵۳ھ میں امارت شرعیہ کی مجلس شوریٰ میں بھی

حضرت مولانا نے اسی مقصد کی تجویز پیش کی۔ تمہید کے بعد اصلی تجویز کے الفاظ یہ ہیں:

امارت شرعیہ اس امر کا اعلان کرتی ہے کہ اگر صوبہ بہار واڑیسہ میں کوئی مجلس اس اصول کے ماتحت قائم ہوتی اور اس کے دستور اساسی و قواعد امارت شرعیہ کے نزدیک قابل اعتماد ہوئے اور اس نے خصوصیت کے ساتھ اپنے دستور اساسی میں اس امر کو داخل کیا کہ......... مجلس (پارٹی) تمام ایسے امور میں جن کا تعلق مسلمانوں کے مذہب سے ہو یا ان کے مذہبی معاملات پر اس کا اثر پڑتا ہو، امارت شرعیہ کی ہدایت و رہنمائی کی پابند ہوگی۔ تو امارت شرعیہ کی پوری ہمدردی و تائید اس مجلس کے ساتھ ہوگی لیکن اگر بدقسمتی سے اس نازک دور میں بھی مسلمانوں کی کوئی مجلس اس قسم کی قائم نہ ہوتی یا اس کے دستور و قواعد پر امارت شرعیہ کا اعتماد نہ ہوا تو امارت شرعیہ ان ہی مقاصد و اغراض کے ماتحت اپنے صوبہ کے مسلم امیدواروں کے لیے ایک عہد نامہ مرتب کر کے شائع کر دے گی تاکہ جو امیدوار اس پر دستخط کر کے امارت شرعیہ کے دفتر میں بھیجیں ان پر غور کر کے امارت شرعیہ کی مختصر مجلس (سب کمیٹی) جن امیدواروں کے انتخاب کو ترجیح دے گی امارت شرعیہ کی پوری ہمدردی و تائید اس کے ساتھ ہوگی۔

اس تجویز کی بنا پر امارت شرعیہ بورڈ کی تشکیل عمل میں آئی اور امارت شرعیہ نے پہلی بار انتخاب میں حصہ لیا۔

دستور ہند ۱۹۳۵ء کا جب نفاذ ہوا۔ اور ہندوستان میں انتخابی پارٹیاں بننے لگیں تو صوبہ بہار میں تین پارٹیوں کی تشکیل ہوئی۔

(۱) بہار مسلم انڈیپینڈنٹ پارٹی (۲) مسلم یونائیٹڈ پارٹی (۳) مسلم احرار پارٹی۔

مسلم انڈیپینڈنٹ پارٹی نے امارت شرعیہ کی تجویز کے مطابق مذہبی معاملات میں

امارت شرعیہ کی ہدایتوں پر عمل کرنے کو منظور کرلیا، اس لیے حضرت مولانا، راقم الحروف اور امارت شرعیہ کے دوسرے کارکن اور حامی اس میں شریک ہو گئے۔

دوسری دونوں پارٹیوں کے ذمہ دار ارکان سے بھی مفاہمت کی گفتگو ہوئی، لیکن وہ آمادۂ مفاہمت نہیں ہوئے اور بالآخر تینوں پارٹیوں (بلکہ کانگریس پارٹی سے بھی بعض حلقوں میں) سخت مقابلہ ہوا، اور امارت شرعیہ کے اثر، اس کے ہمدردوں کی سعی اور حضرت مولانا کی مخلصانہ جدوجہد اور انتھک محنت نے مسلم انڈیپینڈنٹ پارٹی کو کامیاب بنایا، اور دوسری دونوں پارٹیوں کے لیڈروں کو سیاسی میدان چھوڑ دینا پڑا۔

انتخاب کے نتیجہ میں غیر مسلم ارکان میں سب سے زیادہ کانگریس کے ارکان کامیاب ہوئے اور مسلم ارکان میں سب سے زیادہ مسلم انڈیپینڈنٹ پارٹی کے ارکان کو کامیابی ہوئی اس طرح بہار اسمبلی میں کانگریس کے بعد مسلم انڈیپینڈنٹ پارٹی ہی سب سے بڑی پارٹی تھی۔

کانگریس کی غیر متوقع کامیابی نے بعض بڑے کانگریسیوں کا دماغی توازن بگاڑ دیا اور انھوں نے اپنے بیانات میں کہنا شروع کر دیا کہ ہم وزارت بنانے میں کسی دوسری پارٹی سے اشتراک نہیں کر سکتے۔ حالاں کہ وہی لوگ انتخاب کے قبل اپنی اور بعض دوسری پارٹیوں کے اشتراک سے وزارت بنانے کا اظہار کرتے تھے، اور پھر کانگریسی حکومت کی مخالفت کا جو جذبہ عام مسلمانوں میں پیدا ہوا اس سے متاثر ہو کر حضرت مولانا سے کہا گیا کہ مسلم انڈیپینڈنٹ پارٹی کو حکومت میں شریک کرنے کے لیے کانگریس تیار ہے اور غالباً ایک وزیر اور ڈپارلی منٹری سکریٹریوں کی پیش کش کی گئی لیکن حضرت مولانا نے بعض مصالح کی بنا پر اس کو قبول نہیں فرمایا۔

میں نے عرض کیا ہے کہ حضرت مولانا ہر معاملہ میں دین کے فائدے اور مسلمانوں کی بھلائی کو پیش نظر رکھتے تھے۔ چنانچہ انتخاب کے بعد بعض شرائط کی بنا پر کانگریس نے وزارت بنانے

سے انکار کر دیا اور مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کے لیڈر کو وزارت بنانے کی دعوت دی گئی تو اس یقین کے باوجود کہ اس عارضی وزارت کا دَور بہت مختصر ہوگا۔ حضرت مولانا وزارت کی حمایت میں تھے۔ چنانچہ جب مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کی وزارت قائم ہوئی تو حضرت مولانا نے اس سے مفید کام لینے کی سعی فرمائی۔

صوبہ بہار کے سرکاری محکموں میں اردو کا نفاذ حضرت مولانا ہی کی سعی جمیل کا نتیجہ ہے حضرت کی سعی تھی کہ اسی طرح قانون وقف کا بھی نفاذ کر دیا جائے لیکن دفتری کاموں کا تیزی سے طے ہو جانا ناممکن سا ہے مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کی وزارت کا دَور جلد ہی ختم ہو گیا اس لیے قانون وقف نہ بن سکا۔ کانگریس کی حکومت کے قیام کے بعد اس سے بھی حضرت مولانا نے مفید کام لینے اور مسلمانوں کو نقصان دہ امور سے بچانے کی برابر سعی فرمائی۔

سیاسی معاملات میں مسلمانوں کی مخصوص پوزیشن قائم رکھنے کی سعی فرماتے رہے۔

زرعی انکم ٹیکس سے اوقاف اسلامیہ کا استثناء صرف حضرت مولانا کی مضبوط شخصیت اور مخلصانہ سعی کا نتیجہ ہے۔ حضرت مولانا نے مسلم اوقاف کا بل بہار اسمبلی میں مسٹر محمد یونس صاحب سے پیش کرایا، اس کے بعد ہی حکومت کی طرف سے ڈاکٹر سید محمود وزیر تعلیم نے مسلم وقف بل پیش کیا اور اس میں حضرت مولانا کے مشورہ کے مطابق عموماً ترمیمیں منظور ہوئیں اور بہار اسمبلی نے اسے پاس کر دیا، لیکن بہار کونسل سے وہ پاس نہ ہونے پایا تھا کہ کانگریس حکومت مستعفی ہو گئی۔

نکاح، طلاق، تفریق زوجین اور فسخ نکاح وغیرہ کے معاملات میں عدالتوں سے غیر شرعی فیصلوں کا نفاذ ہوتا تھا اور ان سب سے مسلمان بڑی مصیبتوں اور عورتیں مصیبتوں کے ساتھ مصیبتوں میں مبتلا رہتی تھیں۔ امارت شرعیہ کے دارالقضاء سے جو فیصلے ہوتے، وہ شریعت کے مطابق ہوتے اور اس سے مسلمانوں کی معصیتوں اور مصیبتوں کا ازالہ ہوتا لیکن اس کا

فائدہ محدود ہوتا تھا، اور مصیبت عام تھی جس کے ازالہ کی سعی ہر مسلمان پر فرض تھی اور اس کی طرف حضرت مولانا بھی خود اپنے مضامین کے ذریعہ اسمبلی کے ارکان کو توجہ دلاتے تھے اور کبھی راقم الحروف کو لکھنے کا حکم فرماتے تھے۔ چنانچہ اس طرح کے مضامین جریدۂ امارت اور نقیب میں برابر شائع ہوئے ہیں۔ لیکن جب کسی نے مفید مقصد مسودۂ قانون پیش نہیں کیا تو حضرت مولانا نے خود انفساخ نکاح مسلم کا مسودۂ قانون مرتب کر کے نقیب میں شائع کرایا، اور جمعیۃ علماء ہند کو توجہ دلائی۔ چنانچہ پھر جمعیۃ علماء ہند نے ایک مسودۂ قانون انفساخ نکاح مسلم مرتب کیا اور ارکان اسمبلی کو پیش کرنے کی ہدایت کی۔ لیکن یہ مسودۂ قانون جب قانون بن کر منظور ہوا تو اس میں ایسی ترمیم کر دی گئی تھی جس سے یہ قانون مسلمانوں کے لیے شرعاً غیر مفید ہو گیا۔

حضرت مولانا کے حسب ہدایت میں نے اس کے خلاف مضامین لکھے، خود حضرت مولانا نے جمعیۃ علماء ہند کو اس میں ترمیم کرانے کی طرف توجہ دلائی اور جمعیۃ علماء ہند نے اس قانون کی مذمت اور اس میں ترمیم کی تجویز پیش کی، اور بالآخر ایک ممبر نے پھر اس میں ترمیم کی تجویز مرکزی اسمبلی میں پیش کر دی۔ میں نے عرض کیا ہے کہ حضرت مولانا کا مقصد مجالس مقننہ کے انتخاب میں حصہ لینے سے غیر شرعی قوانین کی تنسیخ اور شرعی معاملات کی تنفیذ کی سعی تھی، اور اس سے انھوں نے کسی وقت بھی غفلت نہیں کی۔

یہ تمام لوگوں کو معلوم ہے کہ حضرت مولانا کانگریس کے حامی و ہمدرد تھے، لیکن اس کا کوئی عمل، کوئی تجویز جو ان کو مسلمان کے لیے مضر معلوم ہوتی تھی اس کی سخت مخالفت فرماتے تھے۔ چنانچہ وارد ھا تعلیمی اسکیم کی جس قدر مخالفت مولانا نے فرمائی اور ان کی نگرانی میں امارت شرعیہ نے انجام دی وہ کسی نے نہیں کی۔ اس کی تفصیل امارت کی مطبوعہ رپورٹ سے معلوم ہو سکتی ہے جو راقم الحروف کی مرتبہ ہے۔

کانگریس حکومت نے جو محکمہ دیہات سدھار قائم کیا تو اس میں اہنسا کی تعلیم داخل کی، حضرت مولانا نے اس کی شدید مخالفت کی اور حضرت مولانا کی مخالفت کی بنا پر دیہات سدھار سے اہنسا کی تعلیم کو خارج کیا گیا۔

حضرت مولانا ہی کی سعی سے ڈاکٹر سید محمود وزیر تعلیم نے ابتدائی تعلیم میں مسلمانوں کے لیے مذہبی تعلیم کے حق کو تسلیم کیا۔

حضرت مولانا کی آخری زندگی کے دو واقعات ایسے ہیں جو چند مخصوص افراد کے علاوہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہیں۔

ایک یہ کہ حضرت مولانا نے مسلمانوں کے معاملات میں کانگریسی حکومت کی غیر منصفانہ روش اور کانگریسی ورکنگ کمیٹی کی غفلتوں اور غلطیوں کے متعلق ایک تحریر مرتب فرمائی تھی جس کو مکتوب کی شکل میں گاندھی جی، بابو راجندر پرشاد، پنڈت جواہر لال نہرو اور حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کو بھیج دیا تھا۔

دوسرا مکتوب جنگ کے متعلق ہز اکسلنسی وائسرائے ہند کے نام بھیجا تھا، جس میں موجودہ جنگ کے متعلق شرعی نقطۂ نظر کی وضاحت فرمائی تھی۔

پہلی چیز بالکل پرائیوٹ تھی اس لیے وہ شائع نہیں کی گئی اور دوسری چیز ایسی ہے جو موجودہ آرڈی ننسوں کی بنا پر شائع نہیں ہو سکتی۔

ان دونوں تحریروں کا مقصد مسلمانوں کی بھلائی اور اعلاء کلمۃ اللہ تھا۔

حضرت مولانا کی زندگی کا مقصد وحید اسلامی نظریہ کے مطابق مسلمانوں کی تنظیم، ان کا وحدت ملّی کا قیام اور ان کی فوضویت کا خاتمہ تھا اور یہ سب کچھ اخلاص کے ساتھ اعلاء کلمۃ اللہ اور اسلام کی رفعت و برتری کے لیے تھا۔ حضرت مولانا جس مجلس میں بھی شریک ہوتے

صرف اسی ایک مقصد کے ساتھ شریک ہوتے، جب کسی مجلس سے یہ توقع منقطع ہو جاتی تو وہ اس سے علیحدہ ہو جاتے۔

حضرت مولانا کے اسلامی نظریہ سے ناواقف افراد کو ان کی مذہبی شدت اور اسلامی مقاصد کے حصول کی سعی سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ وہ مولویوں کا غلبہ و اقتدار چاہتے ہیں۔ ان کے رفقاء کار واقف ہیں کہ ان کا نظریہ یہ نہیں تھا۔ وہ مولویوں کے اقتدار کے خواہش مند نہیں تھے بلکہ دین و مذہب کے اقتدار کے خواہش مند تھے اور صرف مذہب کے اقتدار کے لیے (جس کے اقتدار ہی پر اعلاء کلمۃ اللہ کا انحصار ہے) وہ سب کچھ کرتے تھے۔

امارت شرعیہ کا قیام اور اس کی بست سالہ خدمت مخلصاً للہ محض اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے کی۔

ان کی ہدایت و نگرانی میں امارت شرعیہ نے جو خدمتیں انجام دی ہیں وہ کبھی فراموش نہیں کی جا سکتیں۔ حضرت مولانا اور امارت شرعیہ کے کارکنوں کی تبلیغ و اصلاح سے کم از کم تین ہزار اشخاص کفر کے حلقہ سے نکل کر دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ کم سے کم پچیس ہزار افراد ارتداد کی لعنت سے محفوظ ہو گئے۔ ہزاروں مسلمانوں نے مراسم شرک سے نجات پائی، ہزاروں مسلمان عقائد فاسدہ سے تائب ہوئے۔ ہزاروں مسلمانوں کے جھگڑوں کو مٹا کر ان کو متحد کر دیا۔ مدارس و مکاتب قائم کر کے علم کی روشنی پھیلائی اور تعلیم دے کر نجات کا راستہ بتایا۔ سیلاب، زلزلہ اور دوسری مصیبتوں کے وقت مسلمانوں کی امداد و اعانت فرمائی۔

حضرت مولانا نے جو کچھ بھی کیا، مسلمانوں کے فائدے، دین کی برتری اور کلمۃ اللہ کی برتری کے لیے کیا۔

ان کی زندگی کا ہر کام اللہ کے لیے تھا اور وہ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ

لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ کے مصداق تھے۔

حضرت مولانا اپنی مخصوص صلاحیتوں کے لحاظ سے اپنے تمام معاصرین میں خاص امتیاز رکھتے تھے حضرت مولانا کی مذہبیت اور اخلاص کا نتیجہ تھا کہ وہ اپنے تمام فضل و کمال اور علو منصب کے ساتھ بے انتہا منکسر المزاج اور متواضع تھے۔

افسوس کہ اس مخلص محترم اور مفکر جلیل نے ۷ ارشوال ۱۳۵۹ھ کو اس دنیائے دنی سے اعلیٰ علیین کی طرف رحلت فرمائی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

اللہ تعالیٰ حضرت مولانا رح پر اپنی رحمت نازل کرے، ان کی مغفرت فرمائے اور قبر کو نور سے معمور کرے۔

حضرت مولانا رح ہم سے جدا ہو گئے لیکن ان کے اخلاص اور بلند ہمتی کی یادگاریں آج بھی زندہ ہیں، ان کے قیام و بقا، کی کوشش حضرت مولانا رح کے ہر رفیق، ہر ہمدرد کا فریضہ ہونا چاہیے۔

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

تنظیم شرعی کا مفکر اوّل

از ——— جناب قاضی سید احمد حسین صاحب نزہٹ گیا، سابق ام۔ال۔سی

مولانا رح سے میرا تعارف مدرسہ انوار العلوم گیا کے جلسوں کے سلسلہ میں ہوا تھا ابتدا ہی سے مولانا رح کی اسپرٹ مجاہدانہ تھی۔ امارت شرعیہ کے قیام کا خیال مولانا مرحوم کو بہت پہلے سے تھا لیکن حالات کی ناسازگاری نہ حرف معلوم کو زبان تک لانے کی اجازت دیتی تھی نہ ماحول عمل کا متحمل تھا۔ پھر بھی مجاہدانہ جذبہ مولانا رح کو بے قرار رکھتا تھا۔ چنانچہ جہاد کی بیعت بعض خاص لوگوں سے مولانا رح نے قیام امارت سے بہت پہلے لی تھی۔

وہ اس سلسلہ میں خفیہ انقلاب پسند جماعتوں کی بھی تائید کو جائز رکھتے تھے۔ جنگ عظیم کے زمانہ میں بنگال کی خفیہ سوسائٹیوں کے غبطہ میں مجھ کو خفیہ سوسائٹی بنانے اور آتشیں اسلحہ کی فراہمی کا خیال پیدا ہوا۔ مولانا میرے اس خیال سے نہ صرف واقف تھے بلکہ معین و مشیر بھی تھے۔ چنانچہ مولانا کے ایک دوست نے جب ان کو بتلایا کہ وہ ریوالور بہم پہنچا سکتے ہیں تو مولانا نے مجھ کو ان سے ملا دیا۔ ان صاحب نے مجھ سے سوا یا ڈیڑھ سو روپیہ لیا، ریوالور تو کیا دیتے روپیہ بھی ہضم کر گئے، بہر حال اس سے مولانا رح کے ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ خفیہ سوسائٹی کے سلسلہ میں میرے خیالات اتنی عزیمت کی حد سے نکل کر عمل کی سرحد

تک بھی نہ پہونچے تھے کہ تحریک خلافت شروع ہوگئی اور مولانا سجاد صاحب نے صوبہ بہار میں پہلی خلافت کمیٹی گیا میں قائم کی اور میں اس کا سکریٹری تھا اور پہلی خلافت کانفرنس کے سلسلہ میں مجھ کو مولاناؒ کے ساتھ خلافت کانفرنس میں شرکت کا موقع ملا اور وہاں میں نے پہلی دفعہ گاندھی جی کو دیکھا اور ان کی سیدھی سادھی تقریر سنی، وہ تقریر تھی یا سحر کہ جس نے ہمارے خیال میں انقلاب پیدا کر دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ انقلاب کے لیے یہ خفیہ سوسائٹی کی تحریک بجائے مفید ہونے کے مُضر ہے۔

یہی زمانہ تھا کہ مولانا جمعیۃ العلماء کی تنظیم کر رہے تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد اپنی جماعت "حزب اللہ" بنانے کی کوشش کر رہے تھے، ابھی یہ جماعت بننے نہ پائی تھی کہ مولانا ابوالکلام رانچی میں نظر بند ہوگئے۔ مولانا آزاد سے ہمیں بھی عقیدت تھی، رانچی میں ان کے یہاں بھی آنا جانا تھا، ایک دفعہ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحبؒ سے مولانا ابوالکلام صاحب کے حزب اللہ کا تذکرہ آیا تو مولانا سجاد صاحبؒ نے فرمایا کہ شریعت میں تنظیم اسلامی کا اصول (امارت) ہے، اس بنیاد پر نظم کرنا بہتر ہے۔ اس گفتگو کا تذکرہ رانچی میں مولانا آزاد سے آیا، تذکرہ کے وقت ایسا محسوس ہوا کہ مولانا آزاد نفس مسئلہ تک پہنچ گئے۔ مشتاقانہ مولانا سجاد صاحبؒ سے ملنے کی خواہش کی۔ رانچی جاکر مولانا سجاد صاحب مولانا آزاد صاحب سے ملے اور ہندوستان میں قیام امارت کے قیام سے مولانا آزاد نے اتفاق کر لیا اور مولانا سجاد صاحب نے کوشش شروع کی، مولانا کا خیال تھا کہ پہلے امیر الہند کا انتخاب کر لیا جائے پھر صوبہ وار امارت شرعیہ کا قیام ہو۔ مولانا مرحوم نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اس امر پر راضی کر لیا تھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد امیر الہند ہوں، میں اس وقت جیل میں تھا، مگر جہاں تک یاد آتا ہے جمعیۃ العلماء ہند دہلی کے دوسرے

اجلاس میں مولانا سجاد صاحبؒ نے اس تجویز کو پیش کیا مگر شیخ الہندؒ کی علالت کی وجہ سے جب کہ وہ خطرناک حالت سے گذر رہے تھے، دوسرے اجلاس کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ صوبائی امارت پر بھی نجی صحبتوں میں بحث و گفتگو ہوئی، اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا گیا۔

مولانا مرحوم دہلی سے جب واپس آئے تو سب سے پہلے یہ کام کیا کہ صوبہ بہار میں امارت شرعیہ کے قیام کے لیے جدوجہد میں مصروف ہو گئے اور ۱۳۳۹ھ میں ایک عظیم الشان نمائندہ اجلاس زیر صدارت مولانا ابوالکلام صاحب آزاد جمعیۃ العلماء بہار کا منعقد کیا اور صوبہ بہار کے ارباب حل و عقد کے اجتماع میں امارت شرعیہ کی بنیاد رکھا اور مولانا سید شاہ محمد بدرالدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو باتفاق رائے امیر شریعت منتخب کیا گیا۔ ہندوستان کی تنظیم کے ساتھ مولانا بیرون ہند کے مسلمانوں کی فکر سے بھی کافی دل چسپی رکھتے تھے۔ خصوصاً سرحد کے آزاد علاقہ سے۔ میرے علم میں مولانا نے ایک دفعہ ایک شخص کو ایک معقول رقم صوبہ سرحد کے مجاہدین تک پہنچانے کو دی تھی۔ میرا یقین ہے کہ صوبہ سرحد کے مجاہدین کے ساتھ مولاناؒ کی دل چسپی مرتے دم تک قائم رہی۔

مولانا کی وفات سے تقریباً ایک سال پہلے میں نے ایک دفعہ برسبیل تذکرہ مولانا سے کہا کہ اس صوبہ میں امارت شرعیہ قائم کر کے آپ نے اپنا وقت زندوں کے بجائے مردوں میں ضائع کیا۔ کاش کہ آپ صوبہ سرحد جا کر ایک چھوٹی سی نمونہ کی اسلامی حکومت قائم کیے ہوتے تاکہ دنیا دیکھتی کہ اسلامی حکومت انسانیت کے لیے کیسی رحمت ہے تو مولاناؒ نے فرمایا کہ صوبہ سرحد سے کچھ لوگ میرے لینے کو آئے اور میں بھی جانے کو تیار تھا لیکن امیر شریعت اوّل حضرت مولانا شاہ بدرالدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جانے نہ دیا۔

ان واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا مسلمانوں کی فلاح کی تمام صورتوں کو سوچتے رہتے تھے اور ہندوستان ہو یا بیرون ہند، جہاں کہیں ممکن ہوتا بقدر استطاعت مسلمانوں کی فلاح کی کوشش سے باز نہ رہتے۔

مرض الموت کی حالت میں بھی جو کچھ فرماتے اُس سے بھی یہی جذبہ ظاہر ہوتا تھا۔ بہار کے مسلمانوں کے مصائب و آفات کے لیے ان کا وجود ایک سد سکندری تھا۔ افسوس کہ اب وہ باقی نہیں ہے۔

دُو آنسُو

حضرت مولانا محمد سجّاد رحمۃ اللہ علیہ کی یادیں

(حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رح)

جب سے حضرت مولانا محمد سجاد رح کی وفات کی خبر ملی ہے ایک دن بلکہ شاید کسی دن کا پہر بھی ایسا نہ گذرا ہوگا کہ حضرت مرحوم کی یاد نہ آئی ہو ان کو یاد کرتا ہوں اور مرحوم اقبال کا یہ شعر پڑھتا رہتا ہوں۔ ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مجھے مرحوم سے ایسی ملاقات کا شرف (جس کو ملاقات کہا جاتا ہے) پہلی بار غالباً ۱۹۲۸ء میں حاصل ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جمعیۃ علماء نے اپنی راہ نہرو رپورٹ کے مسئلہ پر کانگریس سے الگ کرلی تھی۔ مراد آباد میں جمعیۃ مرکزیہ کی مجلس منتظمہ کا اجلاس تھا، اس سے فارغ ہو کر میں اپنے اس وقت کے اقامتی وطن امروہہ کے لیے مراد آباد سے دہلی کی ٹرین میں سوار ہوا۔ اسی گاڑی سے حضرت مفتی صاحب مدظلہٗ اور حضرت مولانا محمد سجاد مرحوم دہلی کے لیے روانہ ہوئے۔ مراد آباد سے امروہہ تک راستہ تقریباً صرف ایک گھنٹہ کا ہے۔ اتنے ہی وقت میں وقتی مسائل کے

متعلق جو گفتگو رہی جس میں زیادہ حصہ مولانا سجاد مرحوم ہی کے افادات کا تھا اس سے میں نے پہلی بار یہ اندازہ کیا کہ یہ شخص اپنی شان کا نرالا "عالم" ہے۔

اسی دن میرے قلب پر ان کی عظمت کا سکہ بیٹھ گیا اور میں ان کو دورِ حاضر میں کم از کم طبقۂ علماء میں اسلامی سیاست کا اعلیٰ ماہر سمجھنے لگا۔ میں صاف کہتا ہوں کہ پھر اس کے بعد سے آج تک اس باب میں حلقۂ علماء میں سے کسی کی بھی عظمت وجلالت کا اس درجہ میں قائل نہ ہو سکا۔ پھر اس پہلی صحبت کے بعد کی ہر صحبت اور ہر ملاقات ان کی عظمت کے اس احساس میں اضافہ ہی کرتی رہی۔ مجھے حضرت مرحوم کی جس خصوصیت نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ یہ ہے کہ پارٹی فلنگ اور جماعتی مسلک سے بالاتر ہو کر وہ ہر مسئلہ پر غور کرتے تھے، پہلے کوئی رائے قائم کر کے یا کسی جماعت کے فیصلہ کو سامنے رکھ کر خواہ مخواہ اس کی تائید میں مواد فراہم کرنے کے وہ عادی نہ تھے۔ بلکہ پہلے ملّی ضروریات اور واقعات وحالات پر غور کرتے اور ان میں ڈوب کر غور کرتے اور پھر جس نتیجہ پر پہنچتے اسی کو مسلک بناتے اور اپنے رفقاء سے منوانے کی کوشش کرتے تھے ــــــــ ہندوستان کے سیاسی مسائل میں بھی بس اسلام اور مسلمانوں کی مذہبی ضروریات ہی آپ کی غور و فکر کا مرکز اور محور تھے۔

آپ کے قلم سے نکلی ہوئی چند متفرق چیزیں اب بھی لوگوں کے ہاتھوں میں موجود ہیں مثلاً جمعیۃ علماء کے اجلاس منعقدہ مراد آباد ۱۹۲۵ء کا خطبۂ صدارت، مسلم انڈی پینڈنٹ کانفرنس کا خطبۂ صدارت، کچھ نقیب میں شائع شدہ متفرق مقالات، نظارت امور شرعیہ کی مختصر اسکیم اور مسلم انڈی پینڈنٹ پارٹی کی وہ مفصل تجویز جو مسلم آزاد کانفرنس کے اجلاس دہلی منعقدہ مارچ ۱۹۴۰ء کے لیے مولانا مرحوم ہی نے مرتب کی تھی، ان ہی چیزوں سے سیاسی ذہن بینی اور ہندوستانی مسلمانوں کے اصل مسئلہ کی گرفت اور اس کے ممکن العمل

اور متوقع الحصول صحیح حل کے دریافت میں دوسرے حضرات پر آپ کی سابقیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اس تحزب الاحزاب کے زمانے میں ہمارے علمی اور دینی حلقوں میں بھی جو رشتے مثلاً ہم استاذی، ہم شیخی، یا کسی ایک خاص سلسلہ میں انسلاک وغیرہ وغیرہ جو عموماً اتحاد وارتباط میں مؤثر سمجھے جاتے ہیں، مجھے حضرت ممدوح سے کوئی ایک بھی ان میں سے حاصل نہ تھا، لیکن ان کے اخلاص، ورع وتقویٰ، دین کی بے لوث فدائیت اور سب سے زیادہ سیاسیات میں ان کے پختہ اسلامی اندازِ فکر نے مجھے ان سے اس قدر وابستہ کر دیا تھا کہ اپنے جن محترم بزرگوں سے مجھے اس قسم کی نسبتیں بھی حاصل ہیں ان کے ساتھ بھی مجھے اس سے زیادہ وابستگی نہیں۔

کوئی چھپی حقیقت نہیں اور کم از کم جمعیۃ علماء سے تعلق رکھنے والوں میں تو سب ہی کو معلوم ہوگا کہ کانگریس کی منسٹری قبول کر لینے کے بعد سے راقم الحروف کی ذاتی رائے شرکت کانگریس کے مسئلہ میں جماعت کے عام رجحان کے خلاف رہی، اسی زمانے میں حضرت مرحوم نے جو اس وقت اس مسئلہ میں بہ نسبت دوسرے اکابر کے مجھ سے قریب الخیال تھے منظم شرکت کی ایک خاص شکل تجویز فرمائی اور نظامِ ملت کے عنوان سے ایک مفصل اسکیم اس کے لیے مرتب فرمائی۔ فی الحقیقت شرکت کا یہ صحیح راستہ تھا اور اس نظام کے ماتحت جو شرکت ہوتی وہ یقیناً بہت وزن دار ہوتی۔ مولانا مرحوم نے وہ اسکیم مطالعہ کے لیے مجھے بھی عطا فرمائی۔ میں نے دیکھ کر عرض کیا کہ اگر آپ اس کو جماعت سے منوالیں تو میں اس اصول پر شرکت کا سب سے بڑا حامی ہوں۔ اور اس نظام کو بروئے کار لانے کے لیے چھ مہینے کے لیے اپنی خدمات بھی پیش کر سکتا ہوں۔ ـــــ لیکن بدقسمتی کہ اس وقت غالباً ہمارے تیز رو طبقہ کے اس سے

متفق نہ ہونے کی وجہ سے وہ اسکیم بس یوں ہی رہ گئی اور بعد میں حالات بھی اس کے لیے سازگار نہیں رہے۔

سنہ ۳۷ء سے آخر سنہ ۳۹ء تک اسلامی ہند کی سیاست میں جو بحرانی دور گزرا جس میں ہر خیال کے کارکنوں کا دماغی توازن بگڑ چکا تھا اس وقت جو چند چیدہ حضرات اس رَو میں بہنے سے محفوظ رہے ان میں ایک ممتاز ہستی حضرت مولانا مرحوم کی تھی، میں اس دور میں ان کے خیالات سے اگرچہ کلیۃً یعنی سو فی صدی تو متفق نہ تھا بلکہ صرف قریب تر تھا لیکن اگر کسی کی رائے کو اپنے شرح صدر کے بغیر ماننا ہوتا ہے تو حضرت مرحوم کی رائے کو یقیناً میں اس کا مستحق سمجھتا تھا۔

میں عرض کر چکا کہ ہر معاملے میں دینی مصلحت کو وہ ہر چیز پر مقدم رکھتے تھے، اس لیے اس بارے میں ان سے چوک اور غفلت عموماً نہیں ہوتی تھی۔ کانگریس سے اشتراک کے باوجود مسلمانوں کی تعلیم کے مسئلہ میں بہار کی کانگریسی حکومت کے غلط اور مسلمانوں کے لیے دینی حیثیت سے سخت مضرت رساں رویّہ کی مصلحانہ مخالفت انھوں نے جس ایمانی شان کے ساتھ کی اور پھر جس طرح وزارت کو اپنے رویّہ کی تبدیلی پر مجبور کیا یہ صرف ان ہی کی بے لاگ عزیمت اور دانشمندی کا کرشمہ تھا ـــــ اخبار بیں طبقہ کو یاد ہوگا، اسی سنہ ۴۰ء کے شروع مہینوں میں واحد قومیت کے مسئلے پر گاندھی جی نے اپنے اخبار ہریجن میں مسلسل مضامین لکھنے شروع کیے اور ان میں ایک قوم کے نظریئے کو ایسے انداز میں انھوں نے پیش کیا جس کو اسلام کسی طرح برداشت نہیں کر سکتا بلکہ اگر مسلمان اس کو قبول کر لیں تو یقیناً ان کو دین کے بڑے حصے سے دست بردار ہونا پڑے گا ـــــ کانگریس سے تعلق رکھنے والے ذمہ دار حضرات میں حضرت مولانا مرحوم ہی نے سب سے پہلے پُوری تفصیل کے ساتھ گاندھی جی کو ان کی غلطی پر متنبہ کیا

اور بتلایا کہ واحد قومیت کا جو تصور آپ رکھتے ہیں وہ مسلمانوں کے لیے ناقابل قبول ہونے کے علاوہ واقعات کے لحاظ سے بھی محض غلط ہے اور ایسی متحدہ قومیت کا کوئی تصور اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا جب تک ہندوستان میں ایک مسلمان بھی باقی ہے بلکہ گاندھی جی یا ان کے چیلوں کا اس غلط مفروضہ پر اصرار ہندوستان کے سیاسی مسئلہ کو بجائے آسان کرنے کے اور زیادہ مشکل کر دے گا۔

اسی طرح جب ایک مرتبہ گاندھی جی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اسلام میں "اہنسا" کا تصور ہے تو اپنے حلقہ میں مولانا ہی نے پوری جرأت و عزیمت کے ساتھ سب سے پہلے خلاف قلم اٹھایا اور بتلایا کہ سیاسی حیثیت سے بلند مرتبہ رکھنے کے باوجود گاندھی جی کی معلومات اسلام کے بارے میں ایک طفل مکتب سے زیادہ نہیں ہیں۔

غرض مولانا رح اپنے سیاسی انہماک کے باوجود اپنی ایمانی ذمہ داریوں سے کسی وقت بھی غافل نہیں ہوتے تھے اور جب کوئی چیز اسلام یا مسلمانوں کے مذہبی مفاد کے خلاف سامنے آتی تھی تو اپنی جماعت میں سب سے پہلے اکثر انھیں کا قلم حرکت میں آتا تھا اور چوں کہ اللہ تعالیٰ نے ان امور کی خاص بصیرت بھی عطا فرمائی تھی اس لیے معاملہ کے مخفی مخفی گوشوں کو بھی وہ دیکھ لیتے تھے۔

ایک واقعہ اور یاد آیا۔ لکھنؤ میں مدح صحابہ رض ایجی ٹیشن جاری تھا۔ حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدظلہ اور مولانا مرحوم اس کی قیادت فرما رہے تھے، جمعہ کا دن تھا جس دن کہ قانون امتناع مدح صحابہ رض کی خلاف ورزی کر کے اجتماعی سول نافرمانی کی جاتی تھی۔ ٹیلے کی مسجد اس جنگ کا محاذ تھا، نماز جمعہ کے بعد وہیں پر جلسہ ہوتا تھا، اس کے بعد سول نافرمانی کی جاتی تھی مردوں کے علاوہ عورتوں کا بھی بڑا مجمع ہو جاتا تھا اور ان کے لیے قناتوں کے ذریعہ پردہ کا انتظام کیا جاتا

تھا، جب گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا تو پردہ نشین عورتوں کے مجمع میں سے ایک خط ایک بچّہ کے ذریعہ صدر جلسہ کے نام پہنچا، اس میں ایک عورت نے اپنے دینی ولولہ کا اظہار کیا تھا اور لکھا تھا کہ اس ایجی ٹیشن میں عملی حصہ لینے کا موقع مجھ کو اور میری بہنوں کو بھی دیا جائے اس کے لیے اس خط میں صحابیات کی شرکتِ غزوات کا حوالہ بھی دیا گیا تھا حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدظلہٗ نے جو اس دن جلسہ کے صدر تھے راقم الحروف سے فرمایا کہ لاؤڈ اسپیکر کے پاس جاکر تم اس خط کا میری طرف سے زبانی جواب دے دو اور ان بہنوں کو بتلا دو کہ ابھی تو ہم لوگ باقی ہیں، جب تک ہم میں سے ایک بھی موجود ہے، یہ گوارہ نہیں ہوسکتا کہ آپ اس راہ میں کوئی تکلیف اٹھائیں ——— میں چلنے لگا تو حضرت امیر صاحب مرحوم نے فرمایا کہ اس کے علاوہ مستورات کو یہ بھی سمجھا دینا کہ "حربِ سلمی" (یعنی آئینی جنگ یا سول نافرمانی) اور تلوار کی جنگ کے احکام شریعت میں جداگانہ ہیں۔ تلوار کی لڑائی میں تو خاص حالات میں عورت کے لیے بھی شرکت کا موقع ہوجاتا ہے، مگر یہ آئینی جنگ جس میں اپنے آپ کو گرفتار ہی کرایا جائے اس میں شرکت کا عورتوں کے لیے کوئی موقع نہیں ہوتا بلکہ شرعاً ان کے لیے یہ ناجائز ہے کہ وہ اپنے کو غیر آدمیوں کے ہاتھوں گرفتار کرا کے قید میں جائیں، لہٰذا ان بہنوں کا جذبۂ قربانی تو قابلِ قدر ہے لیکن سول نافرمانی میں عملی شرکت کے خیال کو وہ قطعی طور پر دل سے نکال دیں کہ ان کے حق میں وہ معصیت اور خدا کی نافرمانی کا باعث ہے۔

یہی حضرت مرحوم کی وہ خصوصیات تھیں جنھوں نے مجھے ان کا فریفتہ کر دیا تھا۔ واللہ العظیم اگر میرے بس میں ہوتا تو میں سیاسی کام کرنے والے کم از کم نوجوان علماء کے لیے تو فرض قرار دیتا کہ وہ پہلے کچھ دنوں حضرت مرحوم کی زیر نگرانی ٹریننگ حاصل کریں۔

حضرت مرحوم سے میری آخری ملاقات گذشتہ جولائی کے اواخر میں دہلی میں ہوئی، دوران

گفتگو میں میں نے مختلف سیاسی کانفرنسوں میں دیکھی ہوئی بعض سخت درجے کی شرعی بے عنوانیوں کا ذکر کر کے عرض کیا کہ اس قسم کی سیاسی مجالس میں بعض اوقات بڑی کھلی ہوئی اور خدا کو انتہائی ناراض کرنے والی منکرات بھی دیکھی جاتی ہیں ان کا بقدر استطاعت انسداد اور کم از کم نکیر تو نہایت ہی ضروری ہے، لیکن ہم لوگ اس میں اکثر کمزوری دکھلاتے ہیں اور بے دینوں کے تنگ خیالی کے طعنہ سے ڈر کر خاموش رہتے ہیں، حالاں کہ اس سے ایک بڑا ضرر یہ پہنچ رہا ہے کہ عوام ہم لوگوں کو ہی ایسی منکرات میں شریک سمجھتے ہیں، پھر یا تو دین کے معاملہ میں وہ ہم کو متہم اور ناقابل اعتماد سمجھنے لگتے ہیں اور یا ان کے دلوں سے ان منکرات کی برائی کا احساس زائل ہو جاتا ہے۔

فرمایا: "میں تو اس بارے میں ادنیٰ رواداری کو مداہنت سمجھتا ہوں" پھر ایک سیاسی کانفرنس کا حوالہ دے کر (جو چند ہی روز پہلے دہلی میں ہو چکی تھی) فرمایا کہ اس میں ایک واقعہ اس قسم کا پیش آیا، ہم نے خاموشی جائز نہ سمجھی اور فوراً کہدیا کہ یہ چیز غلط اور معصیت ہے، پھر یک رفت آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور فرمایا کہ فسق والحاد کے عموم وشیوع کی وجہ سے ہماری دینی حس بڑی حد تک ماؤف ہو چکی ہے اور مجھے تو بسا اوقات شبہ ہو جاتا ہے کہ ہم لوگوں میں ایمان کا ادنیٰ درجہ بھی ہے یا نہیں، حدیث میں فرمایا گیا کہ ہاتھ یا زبان سے برائی اور گناہ کو روکنے کی طاقت نہ ہونے کی صورت میں اس سے قلب میں نفرت اور عندالاستطاعت اس کے خلاف عملی یا قولی جہاد کی نیت ہر مسلمان کا فرض ہے اور یہ ایمان کا ایک ادنیٰ درجہ ہے جس کے بعد کوئی اور درجہ ہے ہی نہیں۔ (وَلَيْسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ مِثْقَالُ حَبَّةِ خَرْدَلٍ مِّنْ إِيْمَانٍ أَوْ كَمَا قَالَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ) اور ہم ملاحدہ اور فساق بلکہ کھلے کفار ومشرکین کو اعلانیہ فسق والحاد اور کفر وشرک کرتے دیکھتے ہیں اور بسا اوقات ہمارے قلب میں بھی اس کے خلاف

غیض وغضب پیدا نہیں ہوتا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کے اس ادنیٰ اور آخری درجے سے بھی اس وقت شاید ہم خالی ہوتے ہیں۔"

درحقیقت اپنے ایمان پر خوف وخشیت ہی "رُوحِ ایمان" ہے اور یہی وہ تقویٰ ہے جس کو ابن ابی ملیکہؒ نے صحابہ کرام رضؓ سے باین الفاظ نقل کیا ہے:

(فی البخاری تعلیقاً) قال ابن ابی ملیکۃ لقیتُ ثلٰثین من اصحاب النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم کلّھم یخشیٰ علیٰ نفسہ النفاق۔

یہ تو تھے حضرت مرحوم کے متعلق میرے تاثرات اور منتشر معلومات، اب مجھے دو کلمے حضرت مرحوم کے اُن احباب ورفقاء اور ان عقیدت کیشوں ونیاز مندوں سے بھی عرض کرنے ہیں جو ان کی وفات سے غم زدہ اور اس حادثہ سے سوگوار ہیں۔

میرے بزرگو! اور میرے بھائیو!! دنیا میں یہ دن تو سبھی کے لیے آتا ہے جو یہاں آتا ہے اس کے لیے یہاں سے چلا جانا بھی مقرر ہے تاہم حضرت مولانا رحؒ کی جدائی کا رنج ضرور ہے اور وہ برحق ہے اور خود میں تو اس کو اس درجہ محسوس کرتا ہوں کہ ؎

آنچہ از من گم شدہ گر از سلیماں گم شدے
ہم سلیماں ہم پری ہم اہرمن نگریستے

لیکن کفرانِ نعمت ہوگا اگر اس کا احساس نہ کیا جائے کہ جانے والے نے آپ کو اندھیرے میں نہیں چھوڑا ہے، ان کے پہچاننے والوں اور ان سے تعلق رکھنے والوں کو معلوم ہوگا کہ "ملّتِ اسلامیہ ہندیہ" کے دو مسئلے اس آخری زمانے میں بلکہ ان کی سیاسی زندگی کے آغاز ہی سے ان کی توجہ کا خاص مرکز تھے اور خدا کی قسم اگر قدرت کی طرف سے آج بھی ان کو

بولنے اور اپنی آواز ہم تک پہنچانے کا موقع مل جائے تو مجھے یقین ہے کہ وہ قبر میں سے پکار کے ان ہی دو چیزوں کے متعلق عہد حاضر کے مسلمانوں کو وصیت فرمائیں گے ——
ایک —— قیامِ نظامِ امارت اور نصب امیر فی الہند —— دوسرے ——
کم از کم مسلمانوں کی حد تک " نظامِ شرعی " کو اپنی پوری وسعت کے ساتھ ہندوستان میں مستقل آئینی حیثیت حاصل ہو جانا۔

ان دونوں کاموں کے متعلق حضرت مرحوم نے روشنی حاصل کرنے والوں کے لیے کافی سامان چھوڑا ہے، اب حضرت مرحوم کے ساتھ عقیدت و نیازمندی کا جن کو تعلق ہے بالکم از کم ان دونوں مسئلوں میں وہ حضرت مرحوم کے نقطۂ نظر سے متفق ہیں، ان کا فرض ہے کہ ان دونوں کی تکمیل کی طرف وہ بیش از بیش توجہ کریں اور مرحوم کے نامکمل کاموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا اپنی زندگی کا نصب العین بنالیں، یہی چیز حضرت مرحوم کی روح پاک کو یہاں کی فکروں سے مطمئن اور متوسلین کی طرف سے خوش کر سکتی ہے۔

آخر میں تعزیت مسنونہ اور دعائے رحمت پر اختتام کرتا ہوں۔ اِنَّ فِی اللّٰہِ عزاءً من کلّ مصیبۃٍ و درکاً من کل فائتٍ فباللّٰہ فثقوا وایاہ فارجعوا انما المصاب من حرم الثواب اللّٰھمّ اغفرلہ وارحمہ واجعل الجنۃ الخلد مثواہ برحمتک یا ارحم الراحمین۔

مولاناؒ اور مجالسِ قانون ساز

از: مولانا سید منت اللہ رحمانی، ام - آل - اے، مونگیر

مجالس قانون ساز اور ان کے ذریعہ ملکی و ملی مسائل کے سلجھانے کے سلسلہ میں مولانا سجاد رحمۃ اللہ علیہ نے جو خدمات انجام دیں ان کی فہرست طویل ہے۔ مولانا سید منت اللہ صاحبؒ نے اس مضمون میں صرف ان کاموں کی نشاندھی کی ہے جو ۱۹۳۴ء اور اس کے بعد صوبہ بہار کی مجلس قانون ساز اور بہاری نمایندوں کے انتخاب کے سلسلہ میں مولاناؒ کے ھاتھوں انجام پائے۔
مضمون گو مختصر ہے پھر بھی اس سے مولاناؒ کے آئینی دماغ اور اس کے ثمرات کا اجمالی اندازہ ہو جاتا ہے۔ (م۔ع)

۱۹۳۴ء میں مرکزی اسمبلی کا انتخاب ہوا۔ بہار سے تین مسلمانوں کی نشستیں تھیں، مولاناؒ نے امارت شرعیہ بورڈ کی طرف سے اس الکشن میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ امارت کے تین امیدواروں میں دو تو بلا مقابلہ کامیاب ہوگئے۔ صرف "ترہت" کی نشست میں مقابلہ ہوا۔ امارت کے امیدوار جناب عبدالحمید خان صاحب تھے اور ان کے مقابلہ میں جناب مولوی شفیع داؤدی صاحب تھے ذاتی حیثیت سے ان دو امیدواروں میں کوئی نسبت ہی نہ تھی۔ ترہت میں مولوی شفیع داؤدی کے اثرات بہت تھے اور ان کے مقابلہ میں مولوی عبدالحمید خاں صاحب کی کوئی شخصیت

ہی نہ تھی۔ پھر بھی مولانا رح کے تدبّر نے اس انتخاب کو بہت اہم بنا دیا۔ گرچہ امارت کو تقریباً ایک سو ووٹ سے ناکامی ہوئی لیکن وہ نتیجہ تھا اپنی غلطیوں کا۔ کاش مولانا رح کی ہدایتوں پر عمل کیا جاتا تو یہاں بھی کامیابی قدم چومتی ——— اس انتخاب کے سلسلے میں مجھے بھی کام کرنے اور مولانا ؒ کے ہمراہ دورہ کرنے کا اتفاق ہوا۔ اس دوران میں انتخاب کے متعلق مولانا رح کے خیالات معلوم کرنے کا موقع ملا۔ مولانا رح انتخاب میں اپنے امیدوار کی کامیابی یا ناکامی کو کوئی اہمیت ہی نہ دیتے تھے۔ مولانا علیہ الرحمۃ تمام کام کرنے والوں کو یہی سمجھایا کرتے کہ الیکشن میں اصل چیز امیدوار کی کامیابی نہیں بلکہ اپنے مقاصد کی نشر و اشاعت ہے۔

سنہ ۱۹۳۶ء ہی سے بہار میں مجلس قانون ساز کے عام انتخابات کی تیاریاں ہونے لگیں، مولانا علیہ الرحمۃ نے بھی "بہار مسلم انڈیپینڈنٹ پارٹی" کی بنیاد ڈالی، جس کا سیاسی نقطۂ نگاہ ہندوستان کی مکمل آزادی اور مذہبی نقطۂ نگاہ امارت شرعیہ کے فیصلوں کی پابندی تھا۔

پارٹی کے قیام کے دوران میں مولانا رح سے تفصیلی گفتگو کے مواقع آئے، اس وقت میں نے محسوس کیا کہ مولانا مسلمانوں اور ہندوستان کے تمام مسائل پر اسلامی نقطۂ نگاہ سے غور فرمایا کرتے ہیں۔ مولانا رح کا ایمان تھا کہ اسلامی نظامِ حکومت و زندگی ہی بنی نوع انسان کے دینی اور دنیاوی فلاح کا ضامن ہو سکتا ہے۔ چنانچہ وہ ہر مسئلہ کو اسی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ وہ ہندوستان کی آزادی کے اس لیے خواہاں تھے کہ اسلام غلامی کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ وہ سرمایہ پرستی کے اس لیے مخالف اور کمزوروں اور غریبوں کے حامی تھے کہ اسلام کے مقرر کردہ معاشی نظام کے ذریعہ غربت کو خوشحالی اور کمزوری کو قوت سے بدلا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں مولانا رح کا یہ نظریہ ہی ان کی بڑی خصوصیت تھی۔ جس میں وہ شاید منفرد تھے۔

الیکشن میں حصہ لینے کے سوال پر مولانا علیہ الرحمۃ نے مجھ کو بتلایا کہ ہر قوم یا جماعت کی

ترقی کے لیے ضروری ہے کہ وہ سیاسی اور آئینی طاقت حاصل کرے، خصوصاً اس آئینی دور میں تو اس کے بغیر کسی سیاسی جماعت کا زندہ رہنا ہی مشکل ہے۔ مولانا علیہ الرحمۃ کا خیال تھا کہ مسلمانوں کا اصل مقصد تو ہندوستان میں اسلامی حکومت کا قیام ہے، اس لیے کہ موجودہ تمام طریق حکومت میں اسلامی حکومت ہی کا نظام مکمل ہے۔ لیکن چوں کہ بہ حالات موجودہ براہ راست اسلامی حکومت کے قیام کی راہ میں مشکلات ہیں اس لیے سردست کم از کم ایک ایسی مشترکہ حکومت کے قیام کی کوشش کی جائے جہاں مسلمانوں کے لیے مخصوص نظام ہو۔ مولانا رح کا خیال تھا کہ جس حکومت میں یہ بھی نہ ہو وہ آزاد حکومت نہیں کہی جا سکتی۔

مولانا علیہ الرحمۃ نے آزاد حکومت میں مسلمانوں کے مخصوص نظام کی جو تفصیلات پیش کی تھیں ان کا ماحصل یہ ہے کہ اسلامی نظامِ حکومت کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ تو وہ ہے جس میں مسلم وغیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں اور جو اسلامی حکومت کے اندر بلا امتیاز مذہب و ملت نافذ کیے جائیں گے۔ ان احکام کا تعلق جان مال عزت اور امن عامہ سے ہوگا۔

دوسرا حصہ وہ ہے جسے آج کل کی زبان میں "پرسنل لا" کہہ سکتے ہیں (موجودہ اصطلاح میں پرسنل لا کے معنی بہت محدود ہیں اور مولانا رح کے نظریہ پر حاوی نہیں) اس سے مراد وہ مسائل ہیں جن کا تعلق صرف مسلمانوں سے ہے اور جو اسلامی حکومت میں بھی صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص ہوں گے۔ مولانا رح فرمایا کرتے تھے کہ ملکی آزادی کی جدوجہد میں ہمارا ایک مذہبی مقصد یہ بھی ہے کہ آزاد جمہوری حکومت میں مسلمانوں پر کم از کم اسلامی نظام حکومت کا وہ حصہ تو پوری طرح نافذ ہو سکے جس کا تعلق صرف مسلمانوں سے ہے، چنانچہ انتخابات میں حصہ لینے سے مولانا رح کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ رفتہ رفتہ آئینی طریقہ پر مذکورۂ بالا مقاصد کی طرف قدم بڑھایا جائے اور مرکزی و صوبائی مجالس قانون ساز سے ایسے قوانین مرتب کرائے جائیں جو صحیح اسلامی اصول پر

مرتب کیے گئے ہوں اور جن کا تعلق صرف مسلمانوں سے ہو۔ چنانچہ مولانا رح نے اسی مخصوص نظریہ کے ساتھ بہار مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی قائم کی۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو پارٹی کا منشورِ عام اور پارٹی کانفرنس کا خطبہ استقبالیہ)۔

پارٹی کے قیام کے بعد مولانا رح کو سب سے زیادہ دشواریاں امیدواروں کے انتخاب میں ہوئیں۔ مولانا علیہ الرحمۃ کو ضرورت تھی ایسے امیدواروں کی جن کے دلوں میں ملک کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے کا جذبہ مسلمانوں کا سچا اور مذہبی عقائد و احکام پر پورا اعتقاد ہو، ساتھ ہی ساتھ اتنا سرمایہ بھی ہو کہ انتخاب کے تمام اخراجات کو برداشت کر سکیں۔ ظاہر ہے یہ معیار کتنا دشوار تھا؟ اِن مجبوریوں کے ساتھ پارٹی کے امیدواروں کا انتخاب عمل میں آیا۔

میں اکثر مولانا علیہ الرحمۃ سے کہا کرتا کہ "آپ نے ایک گاڑی میں مختلف نسل کے گھوڑے لگا دیئے ہیں، اب وہ گاڑی چلے گی کیوں کر؟" مولاناؒ مجھے سمجھاتے اور فرماتے، اچھا اِن امیدواروں کو علیحدہ کر کے ان لوگوں کے نام بتاؤ جو مناسب بھی ہوں اور انتخابات میں مقابلہ بھی کر سکیں۔۔ میرے پاس اس کا کیا جواب ہو سکتا تھا، ظاہر ہے۔ لیکن دنیا نے دیکھا کہ مولانا رح نے اپنے غور و تدبر اور بے پناہ قوتِ عمل اور زبردست شخصیت سے پارٹی کا شیرازہ بکھرنے نہ دیا اور اُن سے وہ کام کرائے جو دوسرے کسی صوبہ میں نہ ہو سکے۔

جب انتخابات شروع ہوتے تو مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کا مقابلہ بہار یونائیٹڈ پارٹی، احرار پارٹی، کانگریس پارٹی اور آزاد امیدواروں سے ہوا۔

یونائیٹڈ پارٹی کے روحِ رواں مسٹر سید عبدالعزیز صاحب (بالقابہ) تھے۔ موصوف اس وقت حکومت بہار کے وزیر تعلیم تھے، اس لیے یونائیٹڈ پارٹی کو حکومت کی تائید اور امداد حاصل تھی، خود وزیر موصوف نے اپنے نمائندوں کی کامیابی کے لیے دورے کیے اور وہ

کچھ کیا جو ممکن تھا، لیکن جب انتخاب کا نتیجہ منظر عام پر آیا تو دنیا انگشت بدنداں رہ گئی ——

۳۳ امیدواروں میں صرف ۶ کامیاب —— شاید اسی پسپائی کا نتیجہ تھا کہ مسٹر سید عبدالعزیز پارٹی لیڈر ہونے کے باوجود اسمبلی سے مستعفی ہو گئے۔ گرچہ بعد میں پھر مسلم لیگ کے آغوش میں انھوں نے پناہ لی۔

احرار پارٹی نے اپنی سرگرمی ترہت ڈویژن ہی تک محدود رکھی، کوئی دس بارہ امیدوار کھڑے کیے۔ اس پارٹی کے روح رواں مولوی شفیع داؤدی تھے۔ مولوی صاحب موصوف ترہت میں کافی اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ لیکن اس انتخاب نے انھیں بھی چرکہ دیا۔ کسی نہ کسی طرح تین امیدوار تو کامیاب ہو گئے لیکن خود پارٹی لیڈر مولوی محمد شفیع صاحب داؤدی ناکام رہے۔

کانگریس نے مسلم امیدواروں کے انتخاب سے پہلے مولانا رح سے مصالحت کی گفتگو کی اور تجویز یہ پیش کی کہ انڈیپنڈنٹ پارٹی ۱۴ حلقوں میں اپنے امیدوار کھڑا نہ کرے اور وہاں کانگریسی امیدوار کی مدد کرے۔ مولانا اس تجویز پر راضی نہ ہوئے۔ آپ نے چند امیدواروں کے نام گنائے اور کہا ہم ان کی مدد صرف اس شرط پر کر سکتے ہیں کہ وہ اس بات کا عہد کریں کہ مجالس قانون ساز میں تمام مذہبی معاملات میں امارت شرعیہ کے احکام کی پابندی کریں گے چنانچہ انہی شرائط کے ساتھ سید شاہ محمد عمیر صاحب گیا، سعید الحق صاحب دربھنگہ اور ڈاکٹر سید محمود صاحب سابق وزیر تعلیم کی حمایت کی گئی۔ بلکہ ڈاکٹر صاحب کے لیے دو دو حلقے خالی کر دئے گئے مولوی سعید الحق ابتداءً انڈیپنڈنٹ پارٹی کے امیدوار تھے لیکن بعد میں مولانا علیہ الرحمۃ کو معلوم ہوا کہ انھوں نے کانگریس کے عہدنامہ پر بھی دستخط کر دیا ہے۔ مولانا رح نے خود سعید صاحب کو بلا کر تصدیق کی۔ تصدیق کے بعد آپ نے اس عہدنامہ کو جس پر امیدوار موصوف کے دستخط تھے چاک کر دیا اور امارت شرعیہ کے عہدنامہ پر دستخط کرنے کے بعد ان کی تائید کی۔

کانگریس کے ایسے امیدواروں سے جنھوں نے امارت شرعیہ کے عہدنامہ پر دستخط نہ کیے پارٹی کا مقابلہ بھی ہوا، جہاں بجز ایک کے تمام امیدوار کامیاب رہے۔

مولانا رح شرکت کانگریس کے حامی تھے اور تحریک سول نافرمانی وغیرہ کے زمانے میں کانگریس کے باضابطہ ممبر بھی بن جایا کرتے تھے۔ لیکن جہاں تک مجالس آئین ساز کا تعلق ہے، مکمل سمجھوتہ کے بغیر کانگریس ٹکٹ پر انتخاب لڑنے کے وہ حامی نہیں تھے۔

مولانا رح نے پارٹی ضوابط میں ایک طرف تو یہ دفعہ رکھی کہ مذہبی معاملات میں امارت شرعیہ کے فیصلہ کی پابندی کرنی ہوگی اور دوسری طرف یہ کوشش کی کہ زیادہ سے زیادہ امیدوار امارت شرعیہ کے عہدنامہ پر دستخط کریں۔ مولانا رح کا یہ طریق کار آئینہ دار ہے ان کی رجحان فکری کا وہ چاہتے تھے کہ موجودہ طریق حکومت میں جس قدر قوانین اسلامی اصول کے ماتحت بن سکتے ہوں ان میں زیادہ سے زیادہ مسلمان ممبروں کی تائید حاصل کی جا سکے۔

بہرحال انتخابات ہوئے اور نتیجہ نے بتا دیا کہ انڈیپنڈنٹ پارٹی کو تقریباً اسّی فی صدی کامیابی ہوئی۔

انتخاب کے نتائج ظاہر ہونے کے بعد انڈیپنڈنٹ پارٹی اور اس کے کامیاب ممبروں کا جلسہ منعقد ہوا، اس جلسہ میں مولانا رح نے جو تقریر کی وہ اُن کے مخصوص تدبّر و فراست کی حامل تھی، آپ نے اپنے نظریہ کے مطابق ہندوستان کی آنے والی حکومت کے اصول بتائے اور ممبروں کو اُن کا طریق کار۔

مولانا رح نے اس وقت اپنے تمام ممبروں کو دو مشورے دیئے۔ ایک اندرونی اور دوسرا بیرونی۔ اندرونی مشورہ یہ تھا کہ ہر ممبر کسی ایک خاص شعبہ کا ذمہ دار ہو۔ وہ اس شعبہ کے تمام معلومات حاصل کرے اور اس پر پوری طرح تیار ہو۔ بیرونی کام یہ تھا کہ کوئی ممبر اپنے حلقہ

انتخاب سے غافل نہ ہو۔ وہ اپنے حلقہ میں یا خود کام کرے یا اس کے اخراجات برداشت کرے افسوس ہے کہ پارٹی کے ممبران مولاناؒ کے مشوروں پر کاربند نہ ہو سکے ورنہ آج اسمبلی کے اندر پارٹی کا مقام بہت بلند ہوتا۔

اسی جلسہ میں مولاناؒ کی مرتب کی ہوئی ایک تجویز بھی منظور ہوئی تھی جس میں اپنے مقاصد کو برقرار رکھتے ہوئے کانگریس کے ساتھ اشتراکِ عمل کا اعلان کیا گیا، لیکن کانگریس نے اس طرف کوئی توجہ نہ کی۔ غالباً اس وقت کانگریس کا نظریہ اکثریت والے صوبوں میں خالصاً پارٹی گورنمنٹ قائم کرنا تھا۔ چنانچہ اس کی مخالفت میں پنڈت جواہر لال نہرو جو اس وقت کانگریس کے صدر تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد نے بیانات شائع کیے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے تو یہاں تک کہا کہ ایک شاگرد، دو مختلف استادوں کو کیونکر خوش رکھ سکتا ہے؟

اس مسئلہ میں مولاناؒ مشترکہ وزارت کے قیام کے حامی تھے، چنانچہ ایک مرتبہ انھوں نے اپنے اس خیال کو ایک مشہور رہنما کے سامنے پیش کیا۔ مولاناؒ نے فرمایا:

"نظری اور عملی سیاست کے فرق کو کبھی فراموش نہ کرنا چاہیے۔ مختلف ملکوں کی پارلیمنٹری تاریخ کو دیکھیے۔ مختلف الخیال جماعتیں ایک متحدہ اسکیم بنا کر مشترکہ وزارتیں مرتب کرتی ہیں اور کامیابی کے ساتھ چلاتی ہیں۔ ہاں! ایسے مسائل بھی پیش آجاتے ہیں جن پر اتفاق نہیں ہوتا تو پھر وزارتیں ٹوٹ جاتی ہیں اور ان کی جگہ نئی بنتی ہیں۔"

مولاناؒ نے یہ بھی فرمایا کہ

"آج تو کانگریس گریز کرتی ہے لیکن اگر کانگریس کو موقع ملا تو وہ اقلیت والے

صوبوں میں مشترکہ وزارتیں ضرور مرتب کرے گی۔"

چنانچہ ہم نے مولانا رح کی زندگی ہی میں اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ سرحد اور آسام میں مولانا رح کا خیال حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوا۔ خود یہاں کی صوبائی کانگریس کمیٹی کی مجلس عاملہ کے ذمہ دار اراکین نے ۱۹۳۹ء میں مولانا رح کے سامنے انڈیپینڈنٹ پارٹی کی شرکت سے وزارت مرتب کرنے کی تجویز پیش کی جسے مولانا رح نے بعض وجوہ کی بنا پر قبول نہ فرمایا —— یہی ہے "عملی و نظری" سیاسیات کا فرق!

مارچ ۱۹۳۷ء میں وزارت قبول کرنے کا سوال سامنے آیا۔ میں قبول وزارت کا مخالف تھا اور مولانا رح اس کے حامی۔ میں نے اپنی رائے مولانا رح کے سامنے عرض کردی، اس پر کئی دنوں تک باتیں ہوتی رہیں، میں بھی اپنی پورے علم و واقفیت کے مطابق بحث کرتا رہا۔ شاید کسی اور موقع پر میں نے مولانا رح کا اتنا وقت ضائع نہ کیا ہوگا۔ مولانا رح مجھے پوری شفقت کے ساتھ برابر سمجھاتے رہے۔

صورت حال یہ تھی کہ کانگریس نے ۱۹۳۷ء سے پہلے اپنے اجلاسوں میں اور ورکنگ کمیٹی نے اپنی تجویزوں میں صاف اعلان کردیا تھا کہ دستور جدید ناقص اور قابل استرداد ہے لیکن کانگریس نے چھ صوبوں میں اکثریت حاصل کرتے ہی یہ اعلان کیا کہ اگر گورنر اپنے اختیارات خصوصی کو استعمال نہ کرنے کا یقین دلادیں تو کانگریس وزارت مرتب کرنے کے لیے تیار ہے۔

مولانا رح کا خیال تھا کہ کانگریس کی یہ شرط صحیح نہیں ہے کیوں کہ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ اگر گورنر کانگریس کی شرط تسلیم کرلیتے ہیں تو یہ قانون قابل عمل ہوجاتا ہے حالاں کہ کانگریس کے نقطۂ نگاہ سے یہ قانون قطعی ناقابل عمل تھا۔ اس قانون سے کانگریس کا جو سب سے بڑا اصولی اختلاف تھا وہ گورنر کی مداخلت یا عدم مداخلت کا نہ تھا، وہ یہ تھا کہ قانون بنانے کا حق ہندوستان،

کے بسنے والوں کو حاصل تھا نہ کہ برطانوی پارلیمنٹ کو، اس لیے بہرحال وہ قانون قابل استرداد ہی تھا۔

مولانا رح کے خیال میں ایسی انقلابی جماعتوں کے لیے جو کانسلوں میں قانون مسترد کرانے کی غرض سے پہنچی ہوں دو ہی عملی صورتیں ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ اس قانون کے خلاف غیر آئینی جدوجہد شروع کر دی جائے اور دوسری یہ کہ وزارت مرتب کر کے عوام کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کی کوشش کی جائے اور اس طرح اس قانون کے مسترد کرنے کا سامان فراہم کیا جائے۔

چنانچہ انھیں خیالات کی بنا پر مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی نے وزارت قبول کی، لیکن وزارت قبول کرنے کے وقت ہی پارٹی نے ایک تجویز کے ذریعہ یہ بات صاف کر دی کہ اصولی طور پر اس صوبہ میں وزارت کانگریس کو مرتب کرنی چاہیے تھی لیکن چوں کہ کانگریس اور گورنر کی جنگ ہے اور فی الحال کانگریس کوئی جدوجہد بھی نہیں کرتی ہے، اس لیے یہ پارٹی اس صوبہ میں وزارت بناکر اور عوام کی خدمت کر کے قانون کے آئینی طور پر مسترد کرانے کے مواد فراہم کرے گی، ساتھ ہی ساتھ پارٹی کی دلی خواہش ہے کہ کانگریس اور گورنر کے درمیان سمجھوتہ ہو جائے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ انڈیپنڈنٹ پارٹی کی وزارت نے بعض ایسے کام کیے جن کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اس سلسلہ میں اس کی پہلی خدمت سرکاری دفاتر میں اردو زبان کا اجرا ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ اس میں مولانا رح کی کن کن کوششوں کو دخل تھا۔ بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ اگر مولانا مرحوم اس کے لیے کوشاں نہ ہوتے تو آج بھی یہاں اردو کے ساتھ اچھوت ہی جیسا سلوک ہوتا۔

پارٹی کی دوسری اہم ترین خدمت جس سے صوبہ کے کسان آج تک مستفید ہو رہے

ہیں وہ دفعہ ۱۱۲ کی ترمیم ہے، جس سے کسانوں کو کئی طرح پر تخفیف لگان کا فائدہ پہنچا۔ آج کانگریسی حضرات کسانوں کی بھلائی اور فلاح وبہبود کا دم بھرتے پھرتے ہیں لیکن حقیقتاً یہ کارنامہ ہے انڈیپنڈنٹ پارٹی کا۔ اور یہ سب کچھ مولانا مرحوم ہی کے اشارہ پر ہوا تھا۔

کانگریس کے قبول وزارت کے بعد ہم لوگوں کو مولانا رح کے اس عقیدہ کی صحت کا کافی ثبوت ملا کہ مکمل سمجھوتہ کے بغیر مسلمانوں کو کانگریس کے ٹکٹ پر اسمبلی میں نہ جانا چاہیے۔

ایک مثال ملاحظہ ہو: نمایندہ اسمبلی والی تجویز جب پیش ہوئی تو مولانا رح کے حکم سے پارٹی کی طرف سے دو ترمیمیں پیش کی گئیں:

(۱) نمایندہ اسمبلی کے نمایندے جداگانہ مذہبی حلقوں سے منتخب ہوں۔

(۲) نمایندہ اسمبلی میں کثرت رائے پر فیصلہ نہ ہو، بلکہ باہمی رضامندی شرط قرار دی جائے۔

ان ترمیموں کی معقولیت ظاہر ہے۔ لیکن پھر بھی ان ترمیموں پر کئی دنوں تک مباحثے ہوتے رہے۔ وزیر اعظم نے اپنی جوابی تقریریں اور ایوان سے باہر وزیر مالیات نے ہمیں بتایا کہ یہ تجویز کانگریس ورکنگ کمیٹی کی منظور شدہ ہے اس لیے کسی ترمیم کی گنجائش نہیں۔

میں نے مولانا رح سے ساری روئداد کہی اور اپنی ذاتی رائے ترمیمیں واپس لینے کے حق میں دی۔ لیکن مولانا رح کو ان ترمیموں پر برابر اصرار رہا اور وہ کہتے رہے کہ یہ سارے بہانے ہیں ورنہ اگر وزیر اعظم چاہیں تو ابھی چند منٹوں کے اندر صدر کانگریس سے فون پر طے کر سکتے ہیں مولانا رح کے اس مضبوط رویہ نے بالآخر وزیر اعظم کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ فون پر صدر کانگریس سے مشورہ کریں، چنانچہ صدر کانگریس پنڈت جواہر لال کی مرضی سے یہ ترمیمیں بہار اسمبلی میں منظور ہوئیں۔

یہ تجویز تمام کانگریسی صوبوں میں پیش کی گئی۔ لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ بہار کے علاوہ

تمام صوبوں میں یہ تجویز من وعن منظور ہو گئی۔ صرف سندھ کے ہندو ممبران اپنے نقطۂ نگاہ سے ایک ترمیم منظور کرا سکے۔

مولانا رحمہ کے قانونی نکتہ سنجی کی ایک اور مثال پیش ہے:

بہار اسمبلی میں کانگریس کی طرف سے زراعتی آمدنی پر ٹیکس کا مسودۂ قانون پیش ہوا مولانا رح کو شبہ ہوا کہ کہیں اس قانون کے تحت میں اوقاف بھی نہ آجائیں۔ چنانچہ انھوں نے پورا مسودہ پڑھوا کر سنا، سننے پر مولانا رح کا خدشہ صحیح نکلا۔ ابتداءً مولانا رح کی یہ کوشش رہی کہ ارباب حکومت سے مل کر اس مسئلہ کو باہمی طور پر طے کر لیا جائے۔ لیکن جب وہ اس پر راضی نظر نہ آئے تو مولانا رح کو اخبارات میں بیانات اور پھر سول نافرمانی کی دھمکی دینا پڑی، اسی دوران میں مولانا ابوالکلام مدظلہ مسئلہ کو سلجھانے کے لیے پٹنہ تشریف لائے اور ان کے مشورہ سے حکومت بہار نے ہم لوگوں کی ترمیم منظور کر لی اور زراعتی آمدنی پر ٹیکس کا قانون اوقاف پر عائد نہ ہو سکا۔

انکم ٹیکس کے قانون میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد مولانا رح نے پارٹی طرف مسلم وقف بل، لوکل باڈیز (ڈسٹرکٹ بورڈوں سے متعلق) بل اور میونسپلٹی کا ترمیمی مسودۂ قانون مرتب کیا۔

جب حکومت ان مسودوں کی اطلاع ملی تو خود اس نے اپنے طور پر مسلم وقف بل اور میونسپلٹی کا ترمیمی بل پیش کیا۔ سب پہلے مسلم وقف بل سامنے آیا۔ مجوزہ بل نہایت ناقص تھا۔ چنانچہ اس پر غور کرنے کے لیے ایک منتخبہ کمیٹی بنی۔ کمیٹی نے اپنے جلسوں میں مولانا رح کو بھی طلب کیا اور ان کی رائے سے بجز دو چار مقامات کے ہر جگہ اتفاق کیا۔ چنانچہ رائے شماری کے وقت پارٹی نے مجموعی طور پر بل کی حمایت کی، البتہ ان مقامات پر جہاں

اتفاق نہ ہو سکا تھا، مخالفت کی۔ پھر بھی یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ صوبۂ بہار کا وقف بل ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے وقف بلوں سے کئی درجہ بہتر ہے۔

ایک دفعہ اس منتخبہ کمیٹی میں ایک اصول مقرر ہوا۔ الفاظ پٹنہ ہائی کورٹ کے مشہور وکیل مولوی حسن جان صاحب کے تھے۔ لیکن ایڈوکیٹ جنرل نے اس پر قانونی حیثیت سے اعتراض کیا۔ پھر اسی اصول کی ترتیب مسٹر محمد یونس بیرسٹر نے کی، ایڈوکیٹ جنرل نے قانونی مجبوریوں کی بنا پر اُسے بھی نامنظور کیا۔ اخیر میں مولانا رحمۃ نے اسے خود مرتب کیا۔ اردو داں ہونے کے سبب سے ایڈوکیٹ جنرل نے اسے خود اور بلا تامل منظور کر لیا۔[1]

اس کے کچھ ہی دنوں بعد ایک غیر سرکاری مسودۂ قانون جہیز بل (اڈواری بل) کے نام سے پیش ہوا۔ مولانا رحمۃ کی دور بین نگاہوں نے اس کے مضر اثرات کا فوراً اندازہ کر لیا اور یہ مولانا رحمۃ ہی کی محنتوں کا نتیجہ تھا کہ اس بل سے مسلمان بَری کر دیئے گئے۔

مولانا رحمۃ کا عقیدہ تھا کہ ہندو اور مسلمانوں کی دو جُداگانہ معاشرتیں ہیں، اس لیے ان کی اصلاح بھی جُداگانہ قوانین کے ذریعہ ہونی چاہیے۔ مولانا رحمۃ اس بات کے برابر کوشاں رہے کہ یہ اصول اسمبلی میں رواج پائے۔ مولانا رحمۃ کا یہ بھی خیال تھا کہ اصولاً ایک فرقہ کے معاشرتی قانون میں دوسرے فرقہ کے رکن کو ووٹ دینے کا بھی حق نہ ہونا چاہیے۔

غرض یہ کہ صوبہ جاتی اور مرکزی اسمبلی میں حج بل، معلّم بل اور مسودۂ قانون انفساخ نکاح وغیرہ کے سلسلہ میں جو خدمات مولانا رحمۃ نے انجام دی ہیں ان کی داد کوئی ماہر قانون ہی دے سکتا ہے۔ کاش کوئی اللہ کا بندہ ان کی تفصیلات کو قلم بند کر لیتا تو اسلامی

---

[1] جناب ڈاکٹر سید محمود صاحب بالقابہ کے مضمون میں بھی اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

قانون کی ایک بڑی خدمت ہوتی۔

افسوس! مولانا رح اس ناپاک دنیا کو چھوڑ کر اس عالم کو سدھارے جہاں کی زندگی ابدی اور سرمدی ہے اور کم سے کم اس صوبہ کی مذہبی اور سیاسی زندگی اپنے ساتھ لیتے گئے۔

اس قحط الرجال کے زمانہ میں مولانا رح کے ایسے سرپرست کا اٹھ جانا مسلمانوں کی شومیٔ قسمت کا آخری نشان ہے۔ اب کون ہے جو مسلمانوں کی ہر تکلیف پر بے چین ہو، ان کی ہر صدا پر لبیک کہے، اور ان کے ہر آڑے وقت پر کام آوے؟

حقیقت یہ ہے کہ جانے والا، بقول مولانا مناظر احسن گیلانی 'مسلم قوم کے سر مزار کا آخری چراغ تھا۔ حق جل مجدہٗ اپنے سچے خادم پر ہمیشہ رحمتوں کی بارش برسائے اور ہم لوگوں کو اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق دے۔

یادِ سجّادؒ

از : ـــــ جناب مولوی سید محمد مجتبیٰ صاحب ام۔اے۔بی۔ایل۔آرگنائزر محکمہ دیہات سدھار بہار

میں نے حضرت مولاناؒ کو پہلی مرتبہ ۱۹۲۰ء کے عدم تعاون اور خلافت کے جلسوں میں بمقام بانکی پور، دیکھا۔ مسٹر مظہر الحق مرحوم نے ایک کوٹھی فریزر روڈ پر ڈاک بنگلہ کے سامنے بنوانی شروع کی تھی مگر ابھی عمارت کرسی تک بلند ہوئی تھی اور کچھ دیواریں کھڑی ہو چکی تھیں کہ کلکتہ کے مخصوص اجلاس نے کانگریس کو عدم تعاون کا جنگی حربہ بخشا اور صوبہ بہار میں مسٹر مظہر الحق صاحب مرحوم نے اس تحریک کی قیادت کی۔ وہ زمین جو آج حسن امام صاحب مرحوم کا رضوان ہے، مسٹر مظہر الحق صاحب مرحوم کی قیادت میں مصاف حریت بنی ہوئی تھی۔ بانکی پور میں جتنے ابتدائی ہنگامہ خیز مجامع ہوئے وہ اسی موجودہ رضوان کی سرزمین پر تحریک عدم تعاون کے ان ہی جلسوں میں حضرت مولاناؒ پہلی بار بانکی پور میں سیاسی پلیٹ فارم پر مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی مرحوم اور مولانا ابو الکلام کے دوش بہ دوش نظر آئے۔ حضرت مولانا سجاد رحمۃ اللہ علیہ کا نام اس سے قبل تحریک خلافت کے ہنگاموں میں مشہور عالم ہو چکا تھا۔ لیکن اُس وقت تک مولاناؒ مدرس اور عالم تھے۔ مدرسہ انوار العلوم گیا سے آپ کا تعلق باقی تھا۔ اب سنہ ۲۰ء کی تحریک عدم تعاون نے مولاناؒ کو خالص سیاسی رہبر بنا دیا۔

مولاناؒ اِن سیاسی مجالس میں تقریر کم کرتے، مگر تجویزوں کی درستگی اور مذہبی نقطۂ نگاہ کی وضاحت میں بہت کافی حصہ لیتے اور یہی پہلو مولاناؒ کی سیاسی زندگی میں ہمیشہ

فوقیت رکھتا تھا۔ یہ موقع ایسا نہیں کہ مولانا رح نے صرف سیاسی تجویزوں کو مذہبی نقطۂ نگاہ
بخشنے میں جو اہم سیاسی اور مذہبی خدمات کی ہیں ان کی تفصیل بیان کی جائے۔ اس خدمت کو
ان کا سیرت نگار بہترین طور پر انجام دے سکتا ہے۔ راقم السطور محض اس مضمون میں مولانا رح کی
سیرت کے اُن نمایاں واقعات کو بیان کرنا چاہتا ہے جو ذاتی مشاہدہ میں آئے۔ ورنہ یہ بحر
سیاست کا شناور اور مسلمانانِ بہار ہی نہیں بلکہ مسلمانانِ ہند کا مذہبی رہبر اپنے کمالاتِ
علمیہ وقوت عملیہ کے فیوض سے جو دولت لازوال اس پریشان حال جماعت مومنین کو دے گیا
اس کی قدر و قیمت کے لیے چشم بصیرت کی تلاش ابھی باقی ہے۔ مشیتِ ایزدی نے
حضرت مولانا رح کو حجاب قدس میں لے لیا مگر ہمیں یقین ہے کہ مسلمین ہند کے لیے مولانا رح کی
مشعل ہدایت ابھی عرصۂ دراز تک مستقبل کو روشن کرتی رہے گی اور جنگ حریت کا خاکہ اس
سے آگے نہ بڑھ سکے گا جس کا نقشہ مولانا رح کا سیاسی و مذہبی دماغ بنا کر چھوڑ گیا ہے۔

حضرت مولانا رح نے ۱۹۲۰ء سے تا دم مرگ سیاسی آزادی کے لیے اپنے کو غایت
انہماک کے ساتھ وقف کر دیا تھا۔ مولانا رح نے سیاست اور مذہب کے اتحاد و اتصال کا نمونہ
امارت شرعیہ بہار کو قائم کیا۔ یہ مولانا رح کی زندگی کا عظیم الشان باب ہے جو ہندوستانی مسلمانوں
کی تاریخ کا ایک اہم ترین مسئلہ ہے۔ آیندہ مؤرخ کا قلم برسوں ان موشگافیوں میں مبتلا
رہے گا کہ امارت شرعیہ کا محرک اصلی کون تھا اور امارت شرعیہ ہند کا مستقل قیام کیوں وجود پذیر نہ ہو سکا
اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن مرحوم کی عظیم شخصیت کے باوجود بھی امارت شرعیہ ہندیہ کا نظام نامہ
مستقل لائحہ عمل اختیار نہ کر سکا، نیز یہ کہ امام الاحرار حضرت مولانا رح کی تحریک قیام امارت شرعیہ
صوبۂ بہار میں کیوں بار آور ہوئی اور خود امام الاحرار بنگال میں جو اُن کا آج تک مستقر ہے، صوبۂ
متحدہ میں جہاں لکھنؤ کے فرنگی محل سے سراج منیر کی جھلک آرہی تھی اور دہلی جہاں ان کا وطن ہے

اور پنجاب میں جہاں کے مسلمان آج بھی دعویٰ قیادت اسلام رکھتے ہیں، امارت شرعیہ کا نظام قائم نہ ہوسکا اور پھر یہ سبب بھی لائق تفتیش ہوگا کہ بہار ایسے صوبے میں جو اسلامستان ہند میں پست ترین صوبہ سمجھا جاتا ہے، کن کمزور ہاتھوں نے امارت شرعیہ کا نظام قائم کردیا جو آج بھی تمام خامیوں کے باوجود حیرت نگاہ بنا ہوا ہے اور جس نے مسلمانان ہند کے سامنے ہمیشہ مذہبی سیاسی نقطۂ نگاہ و پیرایۂ عمل کو بار بار تجربہ کرکے لائق تقلید بنا دیا۔

جمعیۃ علمائے ہند کی تاریخ امارت شرعیہ سے اس طرح وابستہ ہے جیسے دو اہم بڑی ہستیاں اور اس رشتۂ اتحاد خیال و عمل میں بھی صرف ایک ہی روح سرایت کررہی تھی جو آج ہم سے رشتۂ حیات توڑ چکی اور ہم وا امتا داسفا لکھ کر اپنا غم غلط کرنے پر مجبور ہیں۔

ان تمام شئون امنیہ میں بس ایک روح جلوہ فرما تھی اور وہ روحِ سجاد تھی۔

حضرت مولانا رح سے راقم الحروف کے تعلقات خصوصی اسی عہد امارت شرعیہ سے شروع ہوتے ہیں۔

حضرت مولانا رح نے ایک عجیب دماغ پایا تھا، وہ غایت مذہبی اور سیاسی انہماک کے ساتھ ساتھ قانونی پیرایۂ عمل میں بھی بہترین قانون دانوں کے لیے رہبر خیال تھے۔ تحریک عدم تعاون اور خلافت کا دور شدھی اور سنگٹھن کے ہنگاموں میں غائب ہوگیا اور قدرت نے انقلاب کے خوفناک عناصر کو منصۂ شہود پر باہم دست و گریباں کردیا۔ حضرت مولانا رح جہاں ہندو مسلم اتحاد کے شیدائی تھے، وہاں آپ کی زندگی کے یہ نمایاں خصوصیات تھے کہ آپ نے کبھی اصول اسلام کے برتنے میں مداہنت سے کام نہیں لیا۔ شدھی اور سنگٹھن کے ہنگامۂ خونیں میں مولانا رح کی ذات گرامی ہی از اول تا آخر سربکف رہی اور یہ ایک دوسرا عظیم الشان باب مولانا رح کی زندگی کا ہے، جو مولانا رح کے سیرت نگار کی بہترین کوشش اور توجہ کا مستحق ہے۔ یہ وہ دور تھا جو

سنہ ۲۴-۲۵ء سے صوبہ بہار میں شروع ہوا اور سنہ ۳۰، ۳۱، ۳۲ء تک ہمہ گیر رہا۔ تحریک عدم تعاون اور خلافت کے مسلمان قائدین جو کانگریس سے اتحاد عمل پیدا کر چکے تھے اب سر چھپانے لگے لیکن ایک مولانا رح کی ذات گرامی تھی جس نے امارت شرعیہ کے مبلغین کو صف جنگ پر سامنے لا کھڑا کیا۔ اور خود اس کی قیادت کی۔ حضرت امیر شریعت اول و حضرت امیر شریعت ثانی نے حضرت مولانا سجاد کے دست و بازو رہی سے تمام فتنۂ ارتداد، شدھی، سنگٹھن اور فسادات متعلق قربانی گاؤ، جلوس، باجہ انہدام مسجد، اغوا اور ہزاروں دیگر فسادات کا مقابلہ کیا جو ہندو مسلم سیاسی اتحاد کو ملیا میٹ کرنے کے لیے تمام صوبے میں پیدا کیے گئے۔

بتیا کا خوفناک بلوہ، ایک ایسا واقعہ ہائلہ تھا جس نے مولانا سجاد رح کی عظیم شخصیت کے جوہر دکھلائے۔ یہاں پر یہ اشارہ کرنا ضروری ہے کہ امارت شرعیہ نے چمپارن ضلع اور بتیا تحصیل میں جاہل غریب مسلمانوں میں بہترین تنظیم کی ہے جو آج بھی لائق رشک ہے۔

بتیا شہر میں ایک محلہ میر شکار ٹولی کہلاتا ہے، بخلاف روایت چالیس پچاس ہزار ہندوؤں کا مسلح جلوس اس محلہ کی تنگ سڑکوں سے گذرنے لگا، جہاں ایک چھوٹی سی مسجد میں بیس چالیس مسلمان نماز عصر ادا کرنے کو جمع ہوئے تھے، مسلمانوں نے عذر کیا کہ جلوس کا وہ راستہ نہ تھا، آبادی محلہ کی خالص مسلمانوں کی تھی۔ سرداران جلوس نے اس مزاحمت کا جواب مسلح حملوں سے دیا، مسجد بری طرح بے حرمت کی گئی، تمام محلہ جلا کر خاک سیاہ کر دیا گیا اور شہر میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان عام بلوہ ہو گیا۔ ہتھیار عام طور پر استعمال ہوئے، بندوقیں چل گئیں، سینکڑوں مکانات اور دکان لٹ گئے، مسلمان بہت زیادہ مقتول ہوئے، ایک ہندو بھی مارا گیا اور وہ سب کچھ ہوا جو ایسے بلووں میں ہوا کرتا ہے۔

بتیا کے مسلمان عموماً جاہل، غریب اور مزدور پیشہ ہیں، ان کا پُرسان حال اور پیروی کار کوئی

نہ تھا یہی بطل حریت اور رہبر اسلام مسلمانان بتیا کے لیے ملجا و مامن بن کر پہنچا۔ مدرسہ اسلامیہ بتیا میں امارت شرعیہ کے آزمودہ کار نقیب و رئیس حافظ محمد ثانی صاحب[1] و شیخ عدالت حسین کی مدد سے مولانا رحمہ نے پیروی مقدمات کا دفتر کھول ڈالا بہترین قانون داں حضرات باہر سے بلوائے گئے اور تقریباً ایک سال تک تمام مقدمات کی پیروی کی گئی، دنیا جانتی ہے کہ بلوے کے ایسے خوفناک مقدمات کیا ہوتے ہیں۔ قانون کی چیرہ دستیاں کس طرح لوگوں کو پریشان کرتی ہیں، تمام شہر اور مضافات ایک عجیب مصیبت میں مبتلا تھے اور مولانا سجاد رحمہ ان کے ہر مرض کی دوا تھے سے زیادہ مسلمان ماخوذ تھے، جن پر تمام سنگین دفعات عائد کیے گئے تھے، مگر بالآخر ایک ایک مسلمان رہا ہو کر رہا۔ کچھ ہندو سزایاب ہوئے، سرغنہ ہندوؤں کو سخت سخت سزائیں ہوئیں مسلمانوں کو تقریباً پچاس ہزار تاوان حکومت نے دلوائے۔ راقم الحروف تقریباً ایک سال تک مولانا رحمہ کے ہمراہ بطور قانونی مشیر رہا، اس مضمون کے مختصر حدود اجازت نہیں دیتے کہ اس سال بھر کی زندگی کو مفصل بیان کر سکوں، مگر اتنا کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ اصحاب رسول اور قرون اول کے مجاہدین اسلام کے متعلق جو کچھ کتابوں میں پڑھا یا سنا تھا وہ سب ایک مولانا رحمہ کی ذات گرامی میں بچشم خود دیکھا ؎

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست

مولانا رحمہ نے حکومت بہار کے ایوان گورنری سے لے کر ایک ایک ادنی افسر متعلقہ پر مسلمانوں کی بے جرمی اور مظلومیت کا نقشہ بٹھانے میں جو سعی کی ہے اس کا بیان کامل ابھی تشنۂ وقت ہے

---

[1] حافظ محمد ثانی صاحب ایم۔ ایل۔ اے، اور شیخ عدالت حسین صاحب، مولانا مرحوم کے مخصوص رفیقوں میں تھے اور آخر تک ساتھ رہے۔ مسلمانان چمپارن کے ہر درد دکھ میں یہ حضرات سینہ سپر رہتے تھے۔

مولانارح نے اس حادثۂ عظیم پر جو اوّل مراسلہ بہار کے گورنر کے پاس بھیجا اس کا مسودہ خود تیار کیا تھا اور اس خادم کو انگریزی ترجمہ کے لیے مرحمت فرمایا، یہ پہلا موقع تھا کہ اس خادم کو مولانارح کی تحقیق و تلاش اور فراست قانون کے حیرت انگیز قوائے عقلیہ و دماغیہ و علمیہ کا علم ہوا۔ مراسلہ مذکور کی ایک نقل آج بھی محفوظ ہے اور اس کا مطالعہ مولانارح کے سیرت نگار کے لیے ایک مخزن واقعات ہوگا۔

تمام حکام پولیس، مجسٹریٹ اور گورنر کے کونسل کے ممبران بتیا کو اپنا مستقر بنا کر مصروف تحقیقات تھے، مولانارح نے جو دفتر تحقیقات قائم کیا تھا اور وہاں جو کام مولانارح کی ہدایت سے کیا جاتا، حکومت اس کو جاننے کو بے قرار رہتی اور آپ یہ جان کر تعجب کریں گے کہ حکومت نے مولانارح کے طریقۂ تحقیقات کی بارہا تقلید کی۔ اس قسم کا ایک مشہور واقعہ تصویر کشی کا ہے۔ مولانارح نے قانونی ضرورتوں کے لیے تمام مقامات متعلقہ کے فوٹو تیار کرائے، ایک فوٹوگرافر باضابطہ مقرر کیا گیا اور کام جاری ہو گیا۔ پولیس کے افسران حیرت سے پوچھتے کہ اس میں کیا غرض پنہاں تھی، بالآخر پولیس نے بھی فوٹو لینے شروع کیے۔ آپ بس اتنا ہی سن کر اکتفا کریں کہ دفعہ ۳۰۲ تعزیرات ہند یعنی قتل عمد کا جو الزام مسلمانوں پر تھا، اس مقدمہ میں زیادہ کامیابی فوٹو کی وجہ کر ہوئی جس کو دکھلا کر گواہوں سے اس طرح جرح کی گئی کہ اُن کا کذب ظاہر ہو گیا اور مسلمان بے داغ بَری ہو گئے۔

باوجود انتہائی اتحاد عمل کے مولانارح نے شدھی سنگھٹن اور ارتداد کے قضیوں میں ہرگز کانگریس یا مہاسبھائی ہندوؤں کی دوستی کو مداخل نہ بنایا اور سینہ سپر ہو کر محافظتِ اسلام کے لیے آخر وقت تک قربانیاں کرتے رہے۔

ان ہی واقعات میں سے گورکھپور اور چمپارن ضلعوں کے مسلمان گدّیوں کا ارتداد ہے، گدّی ان اضلاع میں مسلمانوں کی وہ جماعت ہے جو مویشیوں کے پالنے اور دودھ، دہی، گھی کی تجارت کا روزگار کرتے ہیں۔ یہ مسلمان گوجر، گوالے یا اہیر ہیں۔ یہ غایت درجہ جاہل اور توہم پرست

ہیں، ان مسلمان گدیوں کی تنظیم بھی مولانا رح کی محیر العقول تنظیمی قوت کا نمونہ تھا۔

اس دور کے خدمات میں چوتر وا ضلع چمپارن کے ڈوموں کی تبلیغ بھی ہے۔ قوانین موجودہ تے جرائم پیشہ اقوام کی اصلاح کے لیے ایک مخصوص و محدود آبادی ضلع چمپارن اور دیگر اضلاع میں قائم کرنے کی کوشش کی ہے جس میں چوتروا کی آبادی نہایت ممتاز ہے۔ جرائم پیشہ اقوام میں مگہیا ڈوموں کی کثیر تعداد یہاں آباد ہے جن کی اصلاح کا کام عرصہ سے مسیحی تبلیغی ادارے کیا کرتے تھے حضرت مولانا رح کی تحریک پر مبلغین امارت کو ان بدنصیب جماعتوں کی اصلاح و تبلیغ کے لیے بھیجا گیا حکومت کے افسران اور مسیحی مبلغین سے جو "سالویشن آرمی" یا مکتی (نجات دہندہ) فوج کہلاتی ہے اختلافات پیدا ہوئے، بالآخر مولانا رح کی جدوجہد سے حکومت نے یہ حق تسلیم کرلیا کہ ان جرائم پیشہ ڈوموں کی اصلاح کا حق ہندو، مسلمان سب کو ہے اس عرصہ میں مبلغین کی کوششوں سے تقریباً ایک سو خاندان مسلمان ہو چکے تھے، مسلمان مبلغین کو حکومت نے اجازت دی کہ وہ ان مسلمان ڈوموں کی مذہبی تربیت کریں۔ اخبارات میں جو مراسلے مولانا رح کے شائع ہوئے اس سے آریہ مبلغین نے بھی زور و شور سے ان جرائم پیشہ اقوام کی اصلاح میں پُرجوش حصہ لینا شروع کیا۔

اس سلسلہ کی ایک اصلاح مولانا رح نے چمپارن ضلع کے ابتدائی اسکولوں اور پاٹھ شالوں میں کی، جہاں مسلمان بچوں کو ہندی تعلیم دی جاتی تھی اور بجائے قرآن کے گیتا پڑھایا جاتا تھا، مولانا رح نے دفتر تعلیمات سے کافی مراسلات کیے اور ادارہ ابتدائی مکاتب کا معائنہ کرکے من و عن حالات حکام بالا کو پہنچائے۔ متعصب افسران ماتحت کو بدلوایا اور مسلمان بچوں کی تعلیم مذہبی کا نظم کرایا اور بکثرت اردو داں مسلمان معلم مقرر کرائے۔

آج مسلمانوں کے سیاسی اختلافات نے کتنی تنگ نظری پھیلادی ہے۔ مسلمانوں کی ایک جماعت نے مرنے والے کو بہت زیادہ مطعون کیا کہ وہ ہندو پرست تھے، کانگریس کے نمک خوار

تھے۔ اور اصول اسلام کو ہندؤں کی خوشنودی پر فروخت کرتے تھے۔ عیاذاً باللہ! فردائے قیامت میں خداوند قدوس کے سامنے ہزاروں کلمہ گو اس امر کی یقینی شہادت دیں گے کہ یہ بندۂ خدا ابوالمحاسن محمد سجاد رح بیس سال تک اس صوبہ میں کم از کم تنہا مجاہد اسلام و حریت تھا جس نے سنت محمدیؐ کے اجرا، اور اصحاب رسول کے نقش پر چلنے میں اپنی جان گنوائی۔ دنیا کی کوئی حرص نہ تھی جس سے یہ ذات گرامی ملوث ہوئی، فقر و فاقہ اس کا مسلک تھا، دعوتِ عمل اس کی گفتار تھی اور وہ سراپا تمسک بالاسلام پر قدم زن تھا۔ ذہاب فی سبیل اللہ اس کی حیاتِ دنیاوی کی تصویر تھی، مسلمانوں کی سیاسی اور مذہبی تنظیم میں اس ذاتِ گرامایہ نے ایک ایک لمحۂ حیات صرف کیا اور دنیا کی کوئی طاقت اس کو مرعوب نہ کرسکی، وہ تنگ نظر نہ تھا کہ ہمسایہ اقوام سے اتحاد عمل کرنے میں جی چراتا، وہ طالب جاہ نہ تھا کہ مسند حکومت پر جلوہ فرما ہو کر مظاہرہ و مقابلہ کرتا۔ اس کی زندگی سراپا جہاد تھی اور وہ خالص مجاہد اسلام تھا۔

بتیا کے بلوہ نے حضرت مولانا رح کے قوائے عقلیہ و عملیہ کو حکومت اور پبلک دونوں کے سامنے انتہائی کمال کے ساتھ دکھلایا اور نظام امارت شرعیہ کو صوبۂ بہار میں غایت درجہ مستحکم کر دیا۔ مبلغین امارت کی وقعت ہر گوشہ میں پیدا ہوئی اور کم از کم اضلاع ترہت میں مسلمانوں کو اس ادارے پر کامل بھروسہ ہو گیا

یہ زمانہ ایسا تھا کہ ہر ضلع اور ہر تحصیل میں ہندو مسلم فسادات رونما ہو رہے تھے، عید قرباں اور درگا پوجا، ہولی اور مہابیری جلوس کے موقعے بلووں کے خطرے کے لیے نہایت پریشان کن ہوتے، بتیا کے بلوے کے بعد ہی مظفر پور ضلع میں پاتے پور تھانہ کے موضع سمر وارہ میں قربانی گاؤ کے لیے ہندؤں نے ایک غریب مسلمان کو شہید کر دیا اور بہتیرے غریب مسلمانوں کو جو اس بستی میں آباد تھے لوٹ لیا۔ اس علاقہ کے قریب ہی دربھنگہ ضلع کے دیہات مسمی سرسونہ میں بقر عید ہی کے

موقع پر دوسرا بلوہ ہوا جس میں ہندوؤں نے مسلمانوں کے گھروں کو لوٹ لیا۔ یہ دو مقدمے بھی کامیابی کے ساتھ لڑے گئے اور حضرت مولانا رح کی جدوجہد برابر شامل حال رہی۔ اس مضمون کا محدود دیباچہ بیان اس کی اجازت نہیں دیتا کہ واقعوں کی تفصیل کی جائے۔ صرف اس نتیجہ کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ حضرت مولانا رح کا اصول عمل ہر واقعہ میں بین طور پر ظاہر ہو جاتا۔ نظام امارت نے باوجود مالی بے مائگی کے ہر موقعہ پر مسلمانان بہار کی مذہبی آزادی برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ مسلمانوں کی مذہبی آزادی پر جب کبھی حملے ہوئے تو حضرت مولانا رح نے بحیثیت نائب امیر شریعت مسلمانوں کی مذہبی آزادی کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہو کر حکومت اور برادران وطن کا مقابلہ کیا اور ایسی جدوجہد کی کہ ہر مرتبہ ظالموں کو سزایاب کرایا اور حکومت سے انصاف کا مطالبہ کر کے خاطر خواہ طور پر قضیوں کو طے کرایا۔ قربانی گاؤ، جلوس اور مساجد و مدارس، مکاتب و اوقاف ان تمام چیزوں کی نگرانی پورے صوبے میں ایک مولانا کی ذات سے وابستہ تھی اور مبلغین امارت اسی مرکز کے گرد گھومتے تھے۔

ان تمام واقعات ہائلہ نے حضرت مولانا رح کو صوبۂ بہار کے گوشہ گوشہ سے وابستہ کر دیا۔ ہر علاقہ کے مسلمان ادنیٰ و اعلیٰ، جاہل اور تعلیم یافتہ آپ سے واقف اور آپ کی عظیم شخصیت سے متاثر ہو گئے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب کہ حج کے متعلق قوانین نافذ ہونے لگے اور وائسرائے کی حکومت نے حج بل کے مسودات پیش کیے، حاجیوں کی واپسی ٹکٹ، جہازوں کے تعین، حاجیوں کی خوراک، معلمین کے لائسنس وغیرہ کے مسائل زیر بحث آ گئے اور در پردہ سیاسی قضیے پیدا ہو گئے۔ یہ باب مولانا رح کی زندگی کا ایسا اہم ہے کہ مولانا رح کا سیرت نگار بھی برسوں غور کرے گا کہ واقعات کی گتھیوں کو کیوں کر سلجھائے۔ ایک واقف کار نے بہت ہی خوب کہا کہ:

"حضرت مولانا سجاد رح کی سیرت لکھنے کے لیے ضرورت ہے کہ کچھ دن اور انتظار کیا جائے تاکہ کچھ شخصیتیں اور بھی عالم فنا کو منتقل ہو جائیں ورنہ خوف ہے کہ

سیرت نگار کا قلم شخصی جھگڑوں میں پھنس جائے گا۔"

یہی وہ عہد ہے جب کہ مولانا رح ہندوستان کی بعض عظیم مسلم شخصیتوں سے مقابل ہوئے اور مفادات اسلام کے لیے آپ نے اعلائے کلمۂ حق میں بیباکانہ جرأت سے کام لیا۔ مولانا رح نے امیر شکیب ارسلان کی کتاب " حاضر العالم الاسلامی " اور دیگر خالص عربی ذرائع کے حوالہ سے وائسرائے کی اسمبلی کے تمام ممبران کو قانون حج کے اصل سیاسی مفہوم سے مطلع کیا اور مسودات پیش شدہ کی مخالفت کا مطالبہ کیا۔ حج کمیٹی کی کارروائیوں پر اعتراضات کیے اور تمام ہندوستان کا دورہ کر کے تمام مسلم اداروں کو آیندہ خطرہ سے مطلع کیا اور حج پر سیاسی اغراض سے جو قانونی پابندیاں ہونے والی تھیں ان کو برملا سمجھانا شروع کیا۔ اس دور میں مولانا رح نے ان قائدین سے مخالفت مول لی جو اب تک مسلمانوں کی اپنے اپنے حلقے میں بلاشرکت غیر نمائندگی کرتے تھے، ان ہی لیڈروں میں ہمارے محترم بزرگ مولوی شفیع داؤدی بھی ہیں جن سے مولانا رح کے سیاسی اختلافات آیندہ الکشنوں میں عجیب تکلیف دہ صورت اختیار کر گئے۔ یہ داستان اس صوبے میں اب تک بھولی نہ گئی ہوگی، اس لیے دُہرانے میں کوئی لطف نہیں۔

---

(۱) حاضر العالم الاسلامی اصل میں امریکی مصنف STODD RD کی کتاب "دی نیو ورلڈ آف اسلام" کا ترجمہ ہے۔ مترجم سید عجاج نویہض ایک روشناس عرب اہل قلم ہیں۔ مجاہد جلیل امیر شکیب ارسلان مدظلہ نے اس پر جابجا حواشی (فٹ نوٹ) لکھے ہیں لیکن امیر البیان کا قلم اور دنیائے اسلام کی سیاست! لکھنے بیٹھے تو حواشی پر قابو نہ پا سکے اور یہ حواشی بھی بڑھ گئے۔ اصل کتاب سے پہلا ایڈیشن عرصہ ہوا دو جلدوں میں چھپا تھا۔ دوسرا ایڈیشن مزید اضافہ کے ساتھ چار جلدوں میں ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا ہے جس میں اصل مصنف کا ایک ربع سے زیادہ نہیں، یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی بین الملی سیاسیات پر دنیا کی کسی زبان میں ایسی کتاب اب تک شائع نہیں ہوئی۔ (م۔ ع)

غرض صرف اس قدر بیان کرنا ہے کہ قانون حج کے واقعات نے مولانارح کو سیاسی پلیٹ فارم پر بہت جلد بلا لیا اور ۱۹۳۰ء کی پہلی مسلم کانفرنس نے مولانارح کے سیاسی تدبر کا ایک نیا نمونہ پیش کیا۔ مولوی شفیع داؤدی کی کوششوں سے بانکی پور پٹنہ کے محلہ مرادپور کی اشرف منزل میں مسلم کانفرنس کا پہلی بار انعقاد ہوا اور مولانا محمد علی مرحوم جو فرانکو (جرمنی) میں بغرض علاج مقیم تھے صدارت کے لیے براہ راست پٹنہ تشریف لائے، یہ وہ وقت تھا جب کہ مولانا محمد علی مرحوم کانگریس سے علیحدہ ہو چکے تھے اور ایک نئے سیاسی پلیٹ فارم کے بنانے میں مشغول تھے۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم نیشنلسٹ کانگریسی مسلمانوں کے سردار تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد اور حکیم اجمل خانصاحب مرحوم کی ہمت افزا رفاقت ان کو حاصل تھی، عین کانفرنس کے موقع پر ڈاکٹر انصاری صاحب بھی پٹنہ بلائے گئے اور نیشنلسٹ مسلمانوں نے ان کی صدارت میں علیحدہ کانفرنس کرنا چاہا۔ ڈاکٹر انصاری صاحب سر علی امام کے مہمان تھے اور مولانا محمد علی مرحوم مسٹر عبدالعزیز کی کوٹھی "دریا" میں رونق افروز۔ اس تیرا نے شہر عظیم آباد کی نئی آبادی میں سخت ہنگامے کا خطرہ تھا۔ سر علی امام کی کوششوں سے ڈاکٹر انصاری اور مولانا محمد علی مرحوم میں مفاہمت کی گفتگو ہوئی اور بالآخر یہ طے پایا کہ مسلم کانفرنس کے کھلے اجلاس میں ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم کو بھی اپنی جماعت کا نقطۂ خیال پیش کرنے کی اجازت دی جائے۔

یہ راز اب کہہ دینے کے قابل ہے کہ ان تمام کوششوں میں حضرت مولانا سجّاد رحمۃ اللہ علیہ کا ہاتھ بھی پیش پیش تھا اور علمائے اسلام میں اس موقع پر بھی ہزاروں آنکھوں نے اگر کسی عالم کو ان سیاسی زعمائے ملت کے دوش بدوش ہی نہیں بلکہ اکثر مواقع پر بہترین مشیر اور رہبر دیکھا تو وہ مولانا سجادرح ہی کی ذات تھی۔

دنیا یہ جانتی ہے کہ مسلم کانفرنس نے کچھ اصولی مطالبات حقوق کے متعلق بنائے۔

لیکن یہ راز اب تک سربستہ ہے کہ حقوق مسلم کی تعریف کس نے بتائی، اس کی حد بندیاں کس نے کیں؟ اور کس طرح وہ مخصوص حقوق تجویز کی شکل میں فرداً فرداً شمار کر کے دنیا کے سامنے پیش کیے گئے؟ مسلم کانفرنس کی مجلس مضامین ہیں مولانا مرحوم نے وہ تجویز جو حقوق مسلمین کو محدود و متعین کرتی ہے کافی بحث و تمحیص کے بعد مولانا محمد علی مرحوم کی استدعا پر قلمبند کر کے دی اور مؤخر الذکر بزرگ نے اس کو انگریزی کا جامہ پہنایا۔

یہ محدود تجویز مسلم کانفرنس کی طرف سے سائمن کمیشن کے سامنے پیش ہوئی اور پھر کچھ دنوں بعد گول میز میں پیش کی گئی اور نئے قالب میں مسٹر محمد علی جناح کے چودہ پوائنٹ میں آگئی اس میں مولانا رح نے اقلیت کے مسائل خصوصاً مسلمانوں کے پرسنل لا کے متعلق قوانین سازی کے متعلق یہ اصول وضع کیا کہ جب تک مسلم نمائندگان کی اکثریت کسی بل پر متفق نہ ہو وہ بل قانون نہ ہو سکے۔ ہمارے مطالبات آج بھی اس حد سے آگے نہیں بڑھے۔

چند ہی سال بعد ۱۹۳۵ء میں مرکزی اسمبلی کا انتخاب درپیش ہوا اور مولانا رح نے جمعیۃ علماء اور امارت شرعیہ کو میدان میں لا کھڑا کیا اور دنیا نے یہ تماشا دیکھا کہ مدرسوں اور خانقاہوں کے بوریہ نشین سیاست کی نئی گتھیاں سلجھانے لگے۔

مسلمان انگریزی داں طبقہ نے مولانا رح کی اس جرأت کو ناقابل معافی سمجھ کر سخت مخالفت کی اور اس مخالفت کا ممتاز واقعہ مولوی شفیع داؤدی صاحب کا مقابلہ انتخاب تھا۔ ایک محدود جماعت انگریزی دانوں کی مولانا محمد سجاد رح کے ہمراہ بھی تھی، لیکن یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اکثریت آخر تک مخالف رہی اور مولوی شفیع الکشن میں کامیاب ہوئے، مولانا رح نے الکشن کو خلاف قانون قرار دینے کے لیے مقدمہ دائر کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ الکشن ٹریبونل کی تحقیقات مولوی شفیع داؤدی کی موافقت میں ہونے کے باوجود وائسرائے نے انتخاب منسوخ کر دیا یہ داستان

ابھی ہماری یاد سے محو نہیں ہوئی۔

امارت الکشن بورڈ کا مینی فسٹو (منشور) اور الکشن کے نتائج نے دو امر واضح کردیا۔ اوّل تو یہ کہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے وقت ایک سیاسی مدبر نے یہ پیشین گوئی[1]

"یہ جنگ اور خاص کر عالم اسلام کی کش مکش ایسا واقعہ ہے کہ خانقاہوں کے حجروں میں رہنے والے اپنا سجادہ و تسبیح چھوڑ کر میدان سیاست میں اُتر آئیں گے اور دیوبند اور ندوۃ العلماء کے بوریہ نشین مسلمانوں کی مذہبی جماعتوں کو میدان میں لا کھڑا کریں گے۔"

۱۹۳۵ء میں یہ جماعت علماء و مشائخ کی سیاست میں عملی حصہ لینے کے لیے پریشان نظر آنے لگی، اور دوسری طرف انگریزی داں طبقہ کو اپنے سیاسی لائحہ عمل پر از سر نو غور کرنا پڑا، ابھی یہ وقت نہیں آیا کہ کامل فیصلہ کیا جائے کہ کون صراط مستقیم پر تھا اور ہے، مگر عالم تلاطم میں طوفان کا شور اور سمندر کا مد و جزر ہر آنکھ کے سامنے عریاں ہو گیا، وہ جو صاحب عزلت تھے میدان میں کود پڑے اور جو طالب سکون تھے حجروں میں جا چھپے۔

۱۹۳۵ء کے قانون کو قبول یا رد کرنے کے ہنگامے اور ۱۹۳۷ء کا صوبہ وار الکشن مولانا سجاد علیہ الرحمۃ کی رہبری کا یکساں ممنون ہے، مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی اور مسلم یونائٹڈ پارٹی اور احرار پارٹی کی انتخابی سرگرمیاں مولانا سجاد رح کی سیاست و تدبر کے لیے ایک نئی اور شاید آخری آماجگاہ بن گئیں۔ مولانا رح کی مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی اکثریت کے ساتھ انتخاب میں کامیاب

---

[1] یہ پیشین گوئی غالباً مارلیسن (سابق پرنسپل ام۔ اے۔ او کالج علی گڑھ) کی ہے، جسے استارڈ نے بھی نقل کیا ہے۔ (م۔ع)

ہوئی مسٹر محمد یونس پارٹی لیڈر کی عارضی سہ و نیم ماہی وزارت بھی مولانا رح کی زندگی کا ایک ممتاز باب ہے جس کی کم از کم ایک درخشاں یادگار اردو زبان کا عدالتوں اور دفتروں میں جاری کرنا ہے، آپ اس وزارت کے متعلق جو کچھ بھی رائے رکھیں اس پر بحث کا یہ موقع نہیں۔ اس کلیہ سے کم اختلاف ہوگا کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا اصل سیاسی مقصد حاصل کر لیا، اور ایک انقلاب عظیم ہندوستان کی سیاست میں برپا کر دیا۔ مسلمانوں کی مذہبی جماعت نے سیاست میں غور و فکر کرنا شروع کر دیا۔ انتخابات میں حصّہ لیے نمایاں اور ممتاز کامیابیاں حاصل کیں اور ان تمام امور میں جن کو مذہبی مسائل سے تعلق ہے، مذہبی جماعت سے استصواب رائے کرنے کے اصول کو منوالیا۔

مولانا رح جادۂ حریت کے ایک مسافر تھے، اور اپنا سفر ختم کر کے منزل مقصود تک پہنچ گئے، اب راستے درست ہوں گے، منزلیں مقرر ہوں گی۔ آرائش و آسائش کے سامان بہم پہنچائے جائیں گے، اور مالِ غنیمت کے حصے بخرے کرنے کے لیے جھگڑے ہوں گے مگر جادۂ عمل کی تاریکی غائب ہو چکی اور وادیٔ مقصود کی خار دار جھاڑیاں کٹ چکیں اب صرف شہسواروں کی یکہ تازی منظر نگاہ ہے۔

وہ کون سا شہسوار ہے جس نے ٹھوکریں نہیں کھائیں؟ مگر صد ہزار آفریں ہے اس رہ نورد پر، جو راہ کی تاریکی اور خطرناکی سے کبھی نہ گھبرایا، اور ہمسفروں کی قلت سے کبھی اس کا دل ملول نہ ہوا۔ جس کو سامانوں کی کمی نے کبھی فکر مند نہ کیا اور جس نے مصیبتوں کے پہاڑ جھیلنے میں کوتاہی نہ کی۔ خدا کی رحمت ہو اس فرشِ خاک پر، جہاں وہ ابدی راحت میں منتظر قیامت ہے۔

علمائے اسلام کی جماعت آیندہ مولانا رح کے افکار و ہدایات کی کیا تاویل کرے گی

یہ کہنا مشکل ہے۔ مگر آج تو اس کو یہ اعتراض بخوشی قبول کر لینا چاہیے کہ کم از کم صوبۂ بہار میں اور یوپی اور دہلی و پنجاب تک مولانا سجادؒ نے علماء کے تفوق کے لیے آخر لمحہ تک جہاد کیا۔ اسلام کے قرن اول سے لے کر آج تک مذہبی جماعت کے تفوق کا مسئلہ دیگر ادیان و ملل کی طرح باعث نزاع رہا اور تاریخ کے صفحات ایسے خونیں داستانوں سے بھرے ہیں، مگر ہندوستان کی سیاسی پامالی کے بعد اس ابھار کی کوئی امید باقی نہ تھی، مولاناؒ نے اپنی جد و جہد سے یہ ثابت کر دیا کہ اس خاکستر میں ابھی کتنی آگ باقی ہے جو اگر قابو میں نہ رکھی گئی تو ایک عالم کو خاک کر دے سکتی ہے۔

مولاناؒ کی زندگی کیا تھی؟ سراپا فقر! آپ کا عمل کیا تھا؟ جہاد فی سبیل اللہ، احیائے سنت اللہ و اعلائے کلمۃ اللہ۔ سامان زندگی اتنا مختصر کہ غربت بھی شرمائے۔ ارادے ایسے بلند کہ بلندی کو شرم آئے۔ گھر اور گھر کی تمام بضاعت اپنے مقصد پر قربان کر چکے تھے۔ پھلواری شریف کے قصبۂ "ناجیہ" میں غلامی سے نجات پانے کے لیے وقت کا انتظار کر رہے تھے، جب سے امارت شرعیہ کا دفتر قائم ہوا پھلواری ہی جائے سکونت قرار پائی۔ تقریباً بیس سال سے پاؤں میں چکر تھا کبھی چین کے دو دن یہاں بھی نصیب نہ ہوئے۔ کچھ دنوں سے جمعیۃ علمائے ہند کے دفتر کو سنبھالنے کے لیے دہلی میں زیادہ رہنا ہوتا تھا۔

ذاتی حیثیت سے مولاناؒ سراپا توکل تھے، عسرت کی زندگی بخندہ پیشانی بسر کرتے، خاندان کی کاشت کا معتد بہ حصہ امانواں راج نے بقایا لگان میں نیلام کرا لیا تھا۔ ایک وسیع مکان خاندان کی رہائش کا موضع پنہسہ، تھانہ دیپ نگر، تحصیل بہار شریف (ضلع پٹنہ) نالندہ روڈ اسٹیشن کے قریب ہی ریلوے لائن سے متصل تھا، جس کے اکثر حصے غیر مرمت اور منہدم ہو گئے ہیں۔

مولاناؒ کس درجہ رضائے الٰہی پرستار تھے، اس کا ایک واقعہ عرض کرنے کو جی چاہتا ہے، مولاناؒ کا ایک جوان لڑکا دیوبند میں تعلیم پا رہا تھا جو خاص مولانا حسین احمد صاحبؒ کے

زیر درس تھا، وہی ایک چراغ خانہ تھا جو سنت ایزدی سے ۱۳۴۱ھ میں غالباً گھر پر سخت بیمار پڑا، مولانا سجاد علیہ الرحمۃ مولانا سعید احمد صاحب کے ہمراہ اضلاع ترہت میں دورہ کر رہے تھے تار چلا گئے، اس لڑکے کی حالت خطرناک ہوگئی اور وہ انتقال کر گیا۔ مولانا رح اس وقت تک سفر ملتوی کرنے پر مائل نہ ہوئے جب تک خطرناک حالت اور ناامیدی کی اطلاع نہ ملی۔ اس حال میں بھی مولانا رح نے جس صبر کا ثبوت دیا اس کی مثالیں عنقا ہیں۔ جن لوگوں نے مولانا رح کو اس وقت دیکھا ہے وہ اس کی شہادت دیں گے کہ مولانا رح نے کس ضبط و صبر سے راضی بہ رضا رہ کر اسلام کی بہترین تعلیم کا نمونہ دکھلایا۔

کتب بینی مولانا رح کا بہترین مشغلہ فرصت تھا۔ کثرت مطالعہ سے آنکھیں بہت کمزور ہوگئی تھیں اور ۱۳۴۰ھ میں آنکھوں کی تکلیف بہت زیادہ ہوگئی تھی مگر مطالعہ کا شوق ویسا ہی باقی تھا۔ اس مختصر سے مضمون میں مولانا رح کے ذوق مطالعہ کی وسعت کو بیان کرنا ممکن نہیں۔ اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ وسعت مطالعہ کا یہ حال تھا کہ مسائل حاضرہ کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جس پر مولانا نہایت تحقیق و تدقیق سے گفتگو کرنے اور حل کرنے پر قادر نہ تھے۔

کانگریسی لیڈروں اور اس کے اداروں سے مولانا رح کے تعلقات ہمیشہ بے لوث رہے اور ایک مثال بھی ایسی نہیں مل سکتی جس میں مولانا رح کا دامن اغراض ذاتی سے وابستہ ہوا ہو۔ مخالفین کے اعتراضات جن بدگمانیوں پر منحصر ہوں ان کی تحقیق کا تو موقع نہیں، مگر مخالفین خود بھی اپنی بدگمانیوں کی کوئی بنیاد آج تک نہ بتا سکے ——— کانگریس کے ساتھ مصلحتاً اتحاد عمل مولانا رح کا کھلا ہوا تدبر تھا۔ اور عملی طور پر جب اسلامی حقوق کی محافظت کانگریس کی مخالفت کی داعی ہوتی تو مولانا رح کانگریس کی مخالفت سے کبھی باز نہ آتے۔ یہی وہ اصول عمل تھا جس کی وجہ کر ان کی ذات گرامی سے کانگریس مرعوب بھی تھی اور خائف بھی۔

جو لوگ سمجھتے ہیں کہ مولانا رح کانگریس یا ہندوؤں سے مرعوب تھے، وہ ان حقائق پر غور کریں جو عارضی وزارت بنانے اور اس پر بیان کے شائع کرنے میں پوشیدہ تھے، جو بُت پرستی کو برداشت کرنے اور مسٹر کرپلانی کے فلسفۂ گاندھی ازم کے جواب میں لکھا گیا۔

حضرت مولانا محمد سجادؒ کی چند خدمات

از: جناب حافظ محمد ثانی صاحب، ام۔ ال۔ اے

ضلع چمپارن پر حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب نائب امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کے اہم احسانات اور بے بہا خدمات کے جذبۂ تشکر، اور مولانا رحمانی ناظم امارت شرعیہ کے اس ارشاد کے باعث کہ آپ کا مضمون حیاتِ سجاد میں ہونا ضروری ہے، کیوں کہ آپ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے حواریوں میں سے ہیں، یہ چند شذرات سپرد قلم ہیں۔ یہ میری عزت افزائی ہے، ورنہ یہ ناچیز اس اعلیٰ خطاب کا اپنے کو مستحق نہیں پاتا۔ حضرت مولانا علیہ الرحمۃ کے ادنیٰ ترین خدام کی فہرست میں میرے نام کا درج پاجانا میرے لیے باعث سعادت وعزت ہے۔

داعی اکبر حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحبؒ نے مسلمانوں کو شرعی تنظیم کی دعوت دی۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں جمعیۃ علماء صوبہ بہار کا اجلاس پٹنہ میں منعقد ہوا اور انتخاب امیر شریعت کا اہم فریضۂ شرعی ادا کیا گیا۔ حضرت مولانا موصوفؒ بحیثیت نائب امیر بتیا ضلع چمپارن میں تشریف لائے۔ ایک عظیم الشان جلسہ مسلمانان ضلع چمپارن کا ہوا۔ دیگر معزز علماء بھی شریک جلسہ تھے۔ حضرت نائب امیر شریعت کے دست مبارک پر مسلمانوں نے سمع وطاعت کی بیعت کی اور شرعی تنظیم کی آواز پر لبیک کہا۔ یہ ضلع سابق ایام میں ظلمت وجہالت کا گہوارہ اور شعاعِ علم سے یکسر محروم تھا، مگر سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد خدائے پاک کی توفیق اور مہربانیوں

سے علمائے حقانیین مثلاً حضرت مولانا جعفر علی صاحب و حضرت مولانا سرفراز علی صاحب
خلفائے کرام غازی اعظم حضرت سید احمد صاحب بریلوی نے ہدایات وارشادات
کے لیے اس ضلع کو منتخب فرمایا، اس کے بعد یوپی کے ایک باخدا بزرگ حضرت مولانا
احسان اللہ صاحب نے اس ضلع میں سلسلۂ تبلیغ و ہدایات جاری رکھا۔ ان ہی مقدس
بزرگوں کے فیوض و برکات سے مسلم آبادیوں میں مسجدیں تعمیر ہوئیں اور مدرسہ حفظ کلام پاک
کی بنیاد ایک غیر معروف بستی سمرا میں ڈالی گئی جس میں آج بھی تقریباً ایک صد طلبہ قرآن پاک
حفظ کر رہے ہیں۔ اور یہ مدرسہ باوجود غیر مستقل ذرائع کے کل طلبہ کے طعام و قیام
و دیگر ضروری اخراجات کا کفیل ہے۔ اس کے بعد ان ہی بزرگوں کے معتقدین نے مختلف
مقامات میں مدارس علوم دینیہ کی بنیاد ڈالی۔

ایک اور خصوصیت اس ضلع کی یہ تھی کہ اس ضلع کے مسلم باشندے زیادہ تر غریب اور
کچھ متوسط الحال تھے۔ کسی مسلم زمیندار اور دولت مند سرمایہ دار کا وجود نہیں تھا اور علوم فرنگ
اور تہذیب جدید کے مسموم جراثیم سے بالکل محفوظ و مامون تھا۔

حضرت نائب امیر شریعت کی دوربیں نگاہوں نے ایک نظر ڈالتے ہی یہ اندازہ لگالیا
کہ اس صوبہ میں یہی ایک ضلع ہے جہاں کے لوگوں میں احکام شریعت بلادلیل حجت قبول کرنے
کی صلاحیت ہے۔ سرمایہ داروں کی جنگ سرمایہ داری حترفین اکابر کا مکر وحیلہ، شیدایان علوم فرنگ
کا جہل مرکب، فریفتگان تہذیب جدید کی سازشیں، حق و صداقت کی دعوت و تبلیغ میں سدراہ
نہیں ہیں۔ ان ہی اسباب کی بنا پر امارت شرعیہ جیسے اہم ترین فریضہ کی دعوت و تبلیغ کے لیے حضرت
مولانا رح نے اس ضلع کی طرف خاص توجہ مبذول فرمائی، چنانچہ یہ ضلع حضرت مولانا رح کے تبلیغی
دورے کی کثرت اور اعلیٰ دینی خدمات پر جس قدر بھی فخر کرے کم ہے۔ چمپارن کی مسلم آبادی کا

کوئی گوشہ ایسا باقی نہیں ہے جو مولانا رح کے ارشادات وہدایات کے فیضان سے محروم ہو۔

مولانا رح کا مخصوص دَورہ تقریبًا ہر سال آخر شعبان سے پورے رمضان المبارک تک ہوتا تھا۔ ۱۹۳۴ء کے زلزلۂ عظیم کے موقع پر آخر رمضان میں حضرت مولانا رح دیہات کے دَورہ سے بتیا تشریف لا رہے تھے۔ ٹرین جیسے ہی بتیا اسٹیشن پر پہونچی کہ دفعتًا زلزلہ شروع ہوا اور مسافرین وحاضرین بدحواسی و پریشانی کے عالم میں شور و غوغا کرنے لگے۔ مولانا مرحوم اپنے عصائے مبارک کو پلیٹ فارم پر ٹیک کر نہایت استقامت کے ساتھ کھڑے ہو کے اللہ اللہ کہنے لگے اور حاضرین کو بھی تلقین کی چنانچہ سب لوگ کیا مسلم اور کیا غیر مسلم اللہ اللہ باآواز بلند کہنے لگے، اس کے بعد سکون ہوا۔ بعض لوگوں سے مولانا رح نے فرمایا کہ حضرت عمر فاروق رضہ کے زمانہ میں ایک دفعہ زلزلہ آیا تھا، انھوں نے اپنا عصائے مبارک زمین پر دبایا خدا نے رحم کیا۔ میں بھی ان کے غلاموں میں ہوں اس لیے میں نے ان کی سنت پر عمل کیا۔ مولانا کے دَورہ میں احقر اور شیخ عدالت حسین صاحب ہمیشہ ساتھ رہتے تھے۔ ہم لوگوں پر مولانا کی ایک خاص شفقت کی نظر رہتی تھی، مولانا کی صحبت اور وعظ و پند میں وہ کشش تھی کہ ہم لوگ اپنی تمام اہم ضروریات کو بالائے طاق رکھ کر ان کی خدمت میں حاضر رہا کرتے تھے اور نکات قرآنی سے حظ روحانی حاصل کیا کرتے تھے۔ مولانا تبحر علمی، سیاست فہمی، ایثار و اخلاص عمل و جذبۂ عمل عجز و انکساری، سادگی و جفاکشی، صبر و استقامت، توکل و قناعت اور دیگر صفات عالیہ سے ایسے متصف تھے کہ یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ خدائے قدوس نے اپنے خاص بندوں کو خاص صفات ودیعت فرما کر کسی خاص اہم فریضہ کی انجام دہی کے لیے بھیجا تھا۔ چنانچہ مولانا رح کے چند مخصوص واقعات قلمبند کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

(۱) حضرت مولانا رح جیٹھ بیساکھ کی چلچلاتی دھوپ اور جلتی تپش میں بیل گاڑی پر بھی

نہایت خوشی کے ساتھ صبح سے شام تک سفر کرتے اور چھتری تک نہیں لگاتے۔

(۲) ایک مرتبہ میں نے عرض کیا بہتر ہوتا کہ حضور کا دورہ اب سے بعد رمضان شریف یا قبل رمضان ہوتا کہ ہم لوگ روزہ میں تکالیف سفر سے نجات پاتے۔ مولانا نے تبسم آمیز لہجہ میں فرمایا کہ رمضان شریف میں عبادت کا زیادہ ثواب ہے۔ اصلاح و ہدایتِ قوم بہت بڑی عبادت ہے جس کو ہم لوگ اس متبرک مہینہ میں ادا کرتے ہیں۔

(۳) مولانا رح قرآن پاک کی تلاوت فرما رہے تھے اور ان پر ایک کیفیت طاری تھی۔ میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ دنیادار دنیاوی دولت پر غرور و فخر کیا کرتے ہیں۔ اللہ پاک نے اپنی مہربانیوں سے کلام پاک کی جو دولت مجھے عطا فرمائی ہے اس کے مقابلہ میں دولت مندوں اور ان کی دولت کی میری نظروں میں کوئی حقیقت نہیں۔

مختصر یہ کہ حضرت رح صحیح معنوں میں علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل اور العلماء ورثۃ الانبیاء کے صحیح مصداق تھے۔

مولانا رح وفات کے تین ہفتہ قبل یعنی رمضان شریف کے آخری ایام میں دفعتہً بتیا تشریف لائے، دو روز قیام فرمایا۔ ایڈیٹر الہلال بھی ان کے ساتھ تھے۔ جمعہ کی نماز کے بعد ایک مختصر تقریر کی، روزہ کے فلسفہ کو بیان کیا اور یہ بھی فرمایا کہ اب میں بوڑھا ہوا ممکن ہے وعظ و نصیحت کا موقع ملے نہ ملے۔ مجھے حیرت تھی کہ مولانا بلا کسی اہم ضرورت کے اس قدر جلدی ہی کیوں تشریف لائے۔ مگر انتقال پُر ملال کی خبر سن کر یہ راز فاش ہوا کہ مولانا رح اپنے مخصوص مقام پر اپنے خاص خادموں سے ہمیشہ کے لیے رُخصت ہونے آئے تھے۔

اب میں چند خدمات خصوصی کا تذکرہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں جن کو مسلمانان چمپارن کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

(۱) ۱۹۲۶ء میں جب کہ تمام ہندوستان میں فتنۂ ارتداد کا زور تھا، ضلع چمپارن میں مسلمان گدی قوم کے تقریباً ۴۰۰ اشخاص مکر و فریب ظلم و جور کے ساتھ مرتد بنائے گئے تھے۔ امارت شرعیہ کے مقامی کارکنوں نے دفتر امارت کو اطلاع دی۔ حضرت مولانا رح خود تشریف لائے اور بعض مقامی کارکن یعنی شیخ عدالت حسین صاحب و حافظ احمد علی صاحب کے ہمراہ دریائے گنڈک پار کر کے چمپارن کے مغربی و جنوبی سرحد سے گذر کر خانقاہ اسرونی حضرت مولانا شاہ عبداللہ صاحب کے یہاں پہونچے جو یوپی کے علاقہ میں چمپارن کی سرحد سے منفصل واقع ہے۔ یوپی کے راجہ تکوہی کا ہی فتنہ کے بڑھانے میں زبردست ہاتھ تھا اور اسی کا اثر یوپی اور چمپارن کے گدیوں پر پڑ رہا تھا۔ مولانا مرحوم نے حضرت شاہ صاحب موصوف کی کوششوں سے مسلمانوں کے ایک جلسۂ عام کا اعلان کر دیا، جس میں گورکھپور سے مولوی سبحان اللہ صاحب اور مولانا آزاد سبحانی بھی تشریف فرما تھے۔ زبردست تبلیغی تقریریں ہوئیں۔ غریب گدیوں کی ہمت افزائی ہوئی۔ راجہ مذکور مرعوب ہوا اور فتنۂ ارتداد کا سدباب ہوا۔ اور تھوڑے دنوں میں یوپی اور چمپارن کے مرتدین ایک ایک کر کے حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ اور مولانا رح نے ارشاد فرمایا کہ فوری مصیبت تو دور ہوئی مگر آئندہ کے لیے ایسا نظم ہونا چاہیے کہ یہ قوم اس فتنہ سے ہمیشہ کے لیے محفوظ رہے۔ چنانچہ حسب ہدایت مولانا رح، مدرسہ اسلامیہ بتیا میں گدیوں کے بچے تعلیم پانے لگے اور دیہاتوں میں متعدد مکاتب کا اجرا ہوا اور آج تک دو مکاتب خاص گدی قوم کے لیے امارت شرعیہ کے زیر نگرانی قائم ہیں اور امارت شرعیہ اخراجات کی کفیل ہے۔ حضرت مولانا رح ہی کی کوششوں سے جناب مولوی شاہ مصطفیٰ احمد صاحب رئیس گیا نے موضع سرا ٹولہ گدیانی میں ایک پختہ مسجد بخرچ مبلغ ساڑھے سات سو روپیہ بنوا دیا اور موضع بھٹولیہ ٹولہ گدیانی میں ایک مسجد خاص شخص نے بنوائی۔ اب اس قوم کے بعض لڑکے

اتنے تعلیم یافتہ ہو گئے ہیں جو اپنی قوم میں تبلیغ و ہدایت کا فریضہ انجام دے سکیں۔

(۲) موضع چوتروا تھانہ بگہا ضلع چمپارن میں تقریباً چار سو گھرانے جرائم پیشہ گہیا ڈوم زیر نگرانی سلوشن آرمی ہیں۔ امارت شرعیہ کے مبلغین و کارکنوں کی کوششوں سے تقریباً ایک سو گھرانے بخوشی مسلمان ہو گئے۔ سولوشن آرمی کے انگریز منیجر نے غریب مسلمانوں پر قسم قسم کے مظالم ڈھانا شروع کیا مگر وہ لوگ صبر و استقامت کے ساتھ آج تک اسلام پر ثابت قدم ہیں۔ ۱۹۲۶ء میں قاضی احمد حسین صاحب جس زمانہ میں کونسل کے ممبر تھے، ان کی کوششوں سے ایک مسلمان معلم کو گورنمنٹ نے بحال کیا جو آج تک تعلیم دے رہے ہیں۔ کانگریسی حکومت کے زمانہ میں میں نے ان نومسلموں کے متعلق گورنمنٹ سے بارہا متعدد سوالات کیے جس کے بعد خود پرائم منسٹر صاحب ہم لوگوں کے ساتھ چوتروا تشریف لے گئے تحقیقات کیا اور اس نتیجہ پر پہونچے کہ سولوشن آرمی کی نگرانی سے ان لوگوں کو نکال کر اچھوت اور مسلمانوں کے مستند اداروں کی نگرانی میں دے دیا جائے ابھی تک یہ معاملہ ناتمام ہی رہا کہ کانگریسی حکومت مستعفی ہو گئی۔

(۳) ۲ر اگست ۱۹۲۷ء کو بتیا میں ایک گہری سازش کے تحت جو مشہور فرقہ دارانہ فساد کرایا گیا تھا اور ہندؤں نے غریب مسلمانوں پر جن جن مصائب کا پہاڑ ڈھایا تھا اس سے تمام ہندوستان واقف ہے۔ بارہ مسلمان جن میں زیادہ تر بوڑھے ضعیف تھے بے رحمی، اور انتہائی ظلم کے ساتھ شہید کیے گئے اور سیکڑوں مجروح ہوتے، بے شمار مکانات نذر آتش کیے گئے اور لوٹے گئے۔ خدا کے پاک کلام اور مسجد کی بے حرمتی کی گئی۔ یہ ایک ایسا ہولناک اور روح فرسا واقعہ تھا کہ تمام شہر پر سناٹا چھایا ہوا تھا اور مسلمان بسبب غربت اور فلاکت کے بدحواس اور پریشان تھے۔ حکام کے طرز تفتیش و برادران وطن کی انتھک کوششوں سے

صاف ظاہر تھا کہ اب مقدمات میں مسلمانوں ہی پر مزید مصیبت نازل ہوگی اور ہندو بال بال بے داغ بچ جائیں گے اور مظلوم مسلمان قید و بند اور دار و رسن کے شکار ہوں گے۔ دوسرے دن صبح کی ٹرین سے منشی سخاوت حسین صاحب عامل امارت شرعیہ کی معرفت ایک دستی خط مولوی شفیع داؤدی ناظم خلافت کمیٹی صوبہ بہار کو اور دوسرا خط حضرت نائب امیر شریعت صوبہ بہار مولانا سید ابوالمحاسن محمد سجاد صاحبؒ کی خدمت میں لکھا اور اردو اخبارات اور خطوط کے ذریعہ صوبہ بہار کے مشہور و ممتاز قانون داں حضرات سے مظلومین کی امداد و اعانت کی اپیل کی مگر افسوس کہ جواب میں ہر طرف سے خاموشی ہی خاموشی رہی۔ عزیز ملت نے ایسے ایسے فسادات میں مسلمانوں ہی پر الزام لگاتے ہوئے امداد سے بے تعلقی کا اظہار فرمایا ہے وہ خط آج تک دفتر میں محفوظ ہے۔ ۴ر اگست کو صبح کی ٹرین سے مولوی شفیع داؤدی صاحب تشریف لائے اور دردناک مناظر کا معائنہ فرما کر بہت متاثر ہوئے چوں کہ شفیع صاحب ابھی تک کانگریس کے ہمنوا تھے اس لیے انھوں نے بتیا کے کانگریسی ہندو اور مسلمان لیڈروں کو جمع کر کے فرمایا کہ بہت ممکن ہے کہ آپ لوگ بھی مقدمات کے سلسلہ میں گرفتار ہو جائیں اس لیے ضروری ہے کہ اپنا اپنا بیان مجھے لکھا دیں تاکہ آپ لوگوں کی غیبت میں ہم اور بابو راجندر پرشاد بتیا آئیں اور آپ لوگوں کے بیان سے فائدہ اٹھائیں، میں اپنا بیان دینے کو مستعد تھا مگر چمپارن کے سب سے بڑے صلح کن اور ست و اہنسا کے پجاری ہندو لیڈر نے فوری بیان دینے سے انکار کیا اور اپنے ہم مذہب ہندو فرقہ سے مشورہ کرنے کے بعد بیان دینے پر ٹلایا۔ شفیع صاحب ان کی ذہنیت کو دیکھ کر بالکل مایوس ہو گئے اور فوراً واپسی کا اظہار کیا ابھی وہ واپس نہ ہوئے تھے کہ ہم مسلمانوں کے دینی مقتدا و سچے ہمدرد و بہی خواہ حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجّاد صاحب انار اللہ مرقدہٗ کی مقدس ہستی

مظلوم ومصیبت زدہ مسلمانوں کے لیے سایۂ رحمت بن کر رونق افروز ہوئی۔ شفیع صاحب یہ کہہ کر
واپس ہو گئے کہ اب مولانا تشریف لا چکے ہیں میری ضرورت نہیں ہے مگر شفیع صاحب نے
مظفر پور پہنچ کر بتیا کے عبرت ناک واقعہ کو بچشم پُرنم مسلمان وکلاء سے بیان کیا بیان سن کر مولوی
عبدالودود صاحب وکیل و مولوی سید مجتبیٰ صاحب وکیل اور مولوی زاہد حسن صاحب
مختار بہ سواری موٹر برسات کے ایام میں مظفر پور سے بتیا تک اسّی میل کی دشوار گذار مسافت
طے کرتے ہوئے پہنچے حضرت مولانا پہلے ہی سے مستقلاً بتیا میں قیام گزیں ہو چکے تھے وہ لوگ
ان سے ملے اور وہ ایک رہ کر مقدمات کے متعلق ضروری اور مفید ہدایات دے کر مظفر پور
تشریف لے گئے۔ مولانا رح نے مظلومین کی اعانت و حفاظت و ظالموں کی سرکوبی کے لیے
بہترین نظم کیا۔ ایک ڈیفنس کمیٹی بنائی اور ایک باضابطہ دفتر کھول دیا جس میں روزانہ صبح سے
بارہ بجے شب تک محررین و ٹائیسٹ اپنے فرائض متعلقہ کو انجام دینے لگے، مالیات کا بہترین
نظم تھا جس سے مظلومین کی امداد اور دیگر ضروری اخراجات میں کوئی دشواری کبھی پیش نہیں
آئی۔ اس زمانہ میں کونسل کا اجلاس رانچی میں ہو رہا تھا۔ شیخ عدالت حسین صاحب و مولوی
مجتبیٰ صاحب وکیل کو ضروری ہدایات کے ماتحت وہاں مولانا نے بھیجا۔ تاکہ مسلمان ممبروں
کے ذریعہ صوبائی گورنمنٹ کی توجہ مظلومین کی طرف منعطف کرائیں۔ مقدمات کی تحقیقات
کی نگرانی کی گئی۔ مسلمانوں کو تاوان دلانے کی زبردست سعی میں کامیابی ہوئی۔ مقدمات
کے انچارج مولوی سید مجتبیٰ صاحب وکیل مظفر پوری بنائے گئے، جنھوں نے نہایت ہی
ایثار و قربانی کے ساتھ تحقیقاتی منزل سے لے کر سیشن کورٹ تک اپنا فریضہ نہایت
خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ مولانا کا قیام چھ سات ماہ مسلسل بتیا میں رہا اور انھوں نے
سب سے پہلے واقعات کے متعلق اپنی خداداد قابلیتوں سے ایک مبسوط و مدلل بیان اردو و انگریزی

اخبارات میں شائع کرایا اور حکام بالا کو بھیجا، اس سے گورنمنٹ متوجہ ہوئی اور ہندوستان کے مسلمان متاثر ہوئے۔ گورنمنٹ کے آفیسران ہوم ممبر اور گورنر تک بتیا آئے اور ظالموں کے انتہائی ظلم وعدوان کا جانکاہ منظر اور مظلومین کی لاچاری اور بے کسی کا دردانگیز تماشا دیکھ کر واپس گئے۔ گورنمنٹ کے افسروں کے طرز تحقیقات میں تبدیلی ہوئی اور ہندوستان کے اہل درد اور مخیر مسلمانوں نے مظلومین کی امداد کے لیے مالی اعانت شروع کردی جن میں جناب سر فخر الدین مرحوم وحاجی عبد الرحمٰن صاحب وکیل مرحوم کے ساڑھے سات سو کی رقم سب سے پہلے پہونچی اور مظلومین وفاقہ کشوں کی فوری امداد میں خرچ ہوئی۔ جزاہم اللہ خیر الجزاء۔

ابتدائی ایام میں طویل مقدمات کے کثیر اخراجات کا تصور غریب ومفلس مسلمانوں کے لیے باعث پریشانی وحیرانی تھا مگر بحمد اللہ مولانا کے بیان کے بعد ان کی مقدس ذات کی برکت سے روپیوں کی بارش شروع ہوئی اور تقریباً بارہ ہزار روپے جمع ہو کر خرچ ہوئے یہ مولانا رح کی بہت بڑی کرامت تھی، مقدمات کی تحقیقاتی منزل میں مسٹر حاجی محمد یونس صاحب، مسٹر سید اصغر یوسف صاحب بیرسٹران پٹنہ ومولوی عبد الودود صاحب وکیل مظفر پور بھی ڈو ایک روز کے لیے تشریف لاتے تھے اور کام کیا تھا اور سیشن کورٹ میں مسٹر سید بشیر الدین صاحب بیرسٹر پٹنہ نے تقریباً ایک ماہ مسلسل قلیل معاوضہ پر اپنی اعلیٰ قانونی قابلیت کا ثبوت دیا، ان تمام جد وجہد کا نتیجہ یہ نکلا کہ سیشن کورٹ سے پانچ مسلمانوں کو ایک سال سے پانچ سال تک سزائے قید ہوئی اور ہائی کورٹ سے یہ بصورت جرمانہ تبدیل ہوئی اور مسلمان قید خانہ سے باہر آئے۔ تقریباً پندرہ ہندؤں کو چار سال سے دس سال تک کی سزا ہوئی، اڈیشنل پولیس کا خرچہ ہندو اور مسلمان دونوں فریق سے وصول ہوا۔ پچاس ہزار کی رقم ہندؤں سے وصول کر کے

بہ صورت معاوضہ نقصانات مسلمانوں کو دلایا گیا۔ ان ہولناک جرائم کی انگریزی عدالت سے یہ سزا ہوئی۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

آہ صد آہ! مسلمانوں کے سچے رہبر، مخلص خادم، مصیبت زدوں کے ہمدرد، رموز شریعت کے واقف، نکات قرآنی کے ماہر، علم بردار حریت، مجاہد اعظم ہمیشہ کے لیے ہندوستان کے حقیقی مسلمانوں کو عموماً اور صوبہ بہار کے مسلمانوں کو خصوصاً داغ مفارقت دے کر عالم بقا کو تشریف فرما ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے فضل و کرم سے اعلیٰ علیین اور فی مقعد صدقٍ عند ملیكٍ مقتدرٍ کا مستحق بنائے۔ ان کی یادگار امارت شرعیہ کو تا قیام قیامت باقی رکھے اور اس کے فیوض و برکات سے مسلمانان بہار کو خصوصاً اور مسلمانان ہند کو عموماً فیض یاب کرے اور ان کے خصوصی ہدایات و ارشادات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ الذی ھدنا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ لقد جاءت رسل ربنا بالحق ونودوا ان تلکم الجنۃ اورثتموھا بما کنتم تعملون۔

مولانا محمد سجادؒ کے محاسن

از: جناب محمد یونس جہا سابق وزیر اعظم حکومت بہار

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے قومی کاموں کے سلسلہ میں میری پہلی ملاقات ۱۹۲۳ء میں "حزب اللہ" کے قیام کے سلسلہ میں ہوئی۔ مولانا رح کا یہ خیال تھا کہ ایسی حالت ہیں کہ ملک میں فتنہ انگیز نفوس کے ہاتھوں فسادات رونما ہوتے رہتے ہیں، جس سے مذہبی احکام وشعار کی بے حرمتی ہوتی ہے، ملک میں بدامنی پھیلتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر ایک طرف مسلمان پریشان ہوتے ہیں تو دوسری طرف حکومت وقت، نیز امن پسند غیر مسلم بھی اس کے اثرات سے قدرتاً محفوظ نہیں رہتے ہیں اور نہ رہ سکتے ہیں۔

اس لیے مقتضائے وقت اور ضرورت کی آواز سے کانوں میں انگلیاں ڈالنا اور اس کی طرف توجہ نہ کرنا، خطرناک نتائج کا موجب ہوگا۔ ضرورت کے ماتحت ملک کے حالات کی بنا پر وقت کا یہ ضروری اور ناگزیر مسئلہ ہے کہ ایک جماعت رضاکاروں کی "حزب اللہ" کے نام سے ہر گاؤں اور تمام شہر و قصبات میں موجود رہے، جو ہر قسم کے فتنہ وفساد کا انسداد کرے اور اس کے لیے وہ اپنی طرف سے ہر طرح کی خدمات کو انجام دے۔ اور ملک کے امن کو ہر ایثار و خدمت سے کام لے کر بحال و برقرار رکھے۔

ہم جانتے ہیں آج جب کہ پانی سر سے اونچا ہو رہا ہے اور اس دور میں فقیر صفت

بزرگ کے اس نظریہ کو آج چوٹی کے لوگ عملاً برتنے پر مجبور ہیں اور مختلف نام سے اس کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔

مولانا مرحوم نے اس سلسلہ میں "اصول و دستور" بھی حزب اللہ کے لیے مرتب کیے تھے اور ان کا خیال تھا کہ پوری تنظیم کے ساتھ بہار کے ہر ہر گوشہ میں حزب اللہ کا قیام ہو جائے۔ جہاں تک مجھ کو یاد ہے کہ اس کا قیام بھی ہوا، اور اس سے اچھے نتائج بھی مرتب ہوئے مگر مسلمانوں کے ہر کام کی طرح یہ بھی ادھورا رہا، جس کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ مولانا مرحوم کی ذات ایک انار و صد بیمار کے مصداق تھی۔ وہ جس وقت تک ایک چیز کی تخلیق کر کے اس کی ابتدائی مبادیات کو درست کر کے عملی ڈھانچہ میں لا کھڑا کرتے، زمانہ دوسری ضروری چیز ان کے سامنے اس طرح لا کر کھڑا کر دیتا کہ وہ اس کی طرف توجہ کرنے پر مجبور ہو جاتے، اور اس کی فکر میں لگ جاتے، اور کوئی دوسرا ایسا صحیح کارکن نہیں ہوتا جو صحیح طور پر مولانا مرحوم کے پہلے کام کو پھیلاتا۔ حزب اللہ کا بھی حشر یہی ہوا ضرورت آج بھی اس کی داعی ہے کہ مولانا مرحوم کے وضع کردہ "دستور و اصول" کے تحت اس کی تمام تنظیم کی جائے۔

مولانا مرحوم کی یہ عجیب خصوصیت تھی کہ وہ وقت کے تقاضا کو خوب سمجھتے تھے اور بر وقت اس کا حل بھی نکال لیتے تھے۔ مولانا مرحوم کے ساتھ قومی، سیاسی، دستوری اور آئینی ہر طرح کے کام کرنے کا مجھ کو شرف حاصل رہا، اور مولانا کے ذہن رسا کے متعلق مجھ کو عملاً ہر قسم کے معاملہ میں اس کے اندازہ کرنے کا موقع ملا ہے کہ وہ کس طرح معاملہ کی روح اور اس کی سیاست کو سمجھ جاتے تھے۔ اور اگر سیاسی اور آئینی معاملہ کے متعلق یہ کہوں کہ مولانا مرحوم کی شخصیت باوجود اس کے کہ موجودہ سیاسی لٹریچر کی زبان سے وہ ناآشنا تھے اور آئین ہند کے دفاتر داسفاد کے مطالعہ سے وہ بالکل دور تھے، وہ اس قدر قریب سے اس کو

دیکھتے تھے کہ اس کے جوار کار رہنے والا ششدر رہ جاتا تھا، تو میری یہ شہادت قیاس و تخمین نہیں ہوگی بلکہ عملی تجربہ ہوگا، جس کی بنیاد واقعات پر ہوگی اور ایسے واقعات پر ہوگی جس کے دامن میں میری سعی بھی تھی اور اس کے انصرام میں میری ناچیز جد و جہد کو دخل بھی تھا۔

پھر سب سے بڑی بات یہ کہ مولانا مرحوم صرف خیالی دنیا کے بادشاہ اور ایسے اسکیم گر نہیں تھے جو بہتر سے بہتر منطقی اسکیم تو تیار کر سکتا ہے اور بہتر سے بہتر خاکہ اور دستور تو وضع کر سکتا ہے مگر اس کے لیے راہ نہیں پیدا کر سکتا ہے اور اس کو عملاً برت کر اس کو عملی تمثال میں کھڑا نہیں کر سکتا ہے۔

بلکہ جامعیت کے لحاظ سے وہ ایسے موڑ پر تھے جو علم و عمل کے کارواں کا نقطۂ اتصال تھا۔ مولانا مرحوم جس چیز کو ڈوب کر فکر کی نگاہ سے ایک مرتبہ دیکھ لیتے تھے تو ساتھ ہی ساتھ وہ اس کے عملی مشکلات پر بھی عبور پا لیتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ پہلے ہی سے اس کو سوچے ہوئے تیار بیٹھے تھے اور اس کے سارے پیچ و خم ان کی نگاہوں کے سامنے ہیں۔

قومی اور مذہبی مقدمات کے سلسلہ میں امارت شرعیہ کے بیسوں ایسے مقدمات فوجداری اور عدالتی ہیں جس میں مولانا مرحوم کے حکم سے مجھ کو اپنی خدمات پیش کرنے کا موقع ملتا رہا ہے، مجھ کو اس کا تجربہ رہا ہے کہ مولانا مرحوم جس طرح دین کے معاملہ میں دین کے مسائل میں دینی مشکلات کے حل میں خصوصی امتیاز کا خصوصی درجہ رکھتے تھے وہ دنیا کے معاملات کے سمجھنے اور ان کی پیچیدگی کے حل میں اور ان کے لیے راہ نکالنے میں بھی خصوصی درک اور عبور رکھتے تھے۔

ان خصوصیات کے ساتھ مولانا مرحوم کی بےنفسی اور تحمل جماعتی اور قومی، دینی

اور مذہبی مفاد کے لیے ہر جا اور بے جا اعتراض کو سُننا اور درگذر کرنا، ایسی خصوصیت تھی کہ اس کی مثال مشکل سے ملے گی ایسے واقعات ہماری آنکھوں نے دیکھے ہیں، اور ایسے دل آزار اور بے محل الزامات میرے کانوں نے سُنے ہیں، جس کا محض جماعتی مفاد کے لیے تحمل کر لینا نہیں بلکہ اس سے درگذر کر لینا اور محض درگذر کر لینا نہیں بلکہ اس طرح سُننا کہ گویا سُنا ہی نہیں، اور دل پر اس کا کوئی اثر ہی نہیں۔ حیرت ہوتی تھی جب وہی شخص دوسرے قومی کام کو لے کر مولانا مرحوم کے پاس آتا تھا تو مولانا مرحوم اس سے اس طرح پورے تپاک اور اخلاص دلی کے ساتھ ملتے تھے۔ اور اس کی باتوں کو سنتے تھے اور اس کے کام کو پوری دردمندی کے ساتھ انجام دیتے تھے کہ گویا آج کے پہلے دنوں میں اس سے کوئی ناگوار بات ظہور میں آئی ہی نہیں ہے نہ اس کا اس سے کوئی ذکر کرتے تھے، نہ اس کے کام میں اس کا کوئی اثر پڑتا تھا۔ مولانا مرحوم کے ہر کام کا اصول یہ تھا کہ اس کے پہلے جو کچھ کیا تھا وہ بھی اللہ کے لیے تھا اور آج بھی جو کچھ کر رہے ہیں وہ بھی اللہ کے لیے ہے۔ درمیانی وسائط کی ذاتیات ان کی نگاہ میں کبھی نہیں رہتی تھی۔

ان کے سامنے اشخاص نہیں رہتے تھے، بلکہ ان کے اعمال رہتے تھے، کسی کی خصوصی ذات کو اُن کی فکر و توجہ کی دنیا میں گذر نہیں تھی اور کسی درجہ میں بھی وہ قابل اعتنا نہ تھی، لیکن اعمال اور انقلاب کی ہر کڑی پر ان کی کڑی نگاہ رہتی تھی اور کبھی ایسے اعمال کو درگذر کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے جو مذہبی احکام یا مذہبی شعار سے ٹکراتے ہوں یا اس کے منافی ہوں۔

ہم پوری بصیرت کے ساتھ یہ جانتے ہیں کہ مولانا مرحوم نے سیاست میں حصہ لیا تو وہ بھی مذہب کے لیے۔ الیکشن میں حصہ لیا تو وہ بھی مذہب کے لیے۔ کانسل اور اسمبلی کے مباحثات میں حصہ لیا تو وہ بھی مذہب کے لیے، اور یہ سب ایسی باتیں ہیں جو انڈیپنڈنٹ پارٹی کے منشور اور اس کے خطبۂ استقبالیہ وغیرہ کے واقف کار پر

روزروشن سے بھی زیادہ واضح ہیں۔

ان کی ہر حرکت و عمل ان کی ہر فکر و نائل کا مرکزی نقطہ مذہب رہتا تھا۔ وہ جب کسی مجلس کے دستور و اصول یا تجویز و بیان یا درمیانی وسائط اور پروگرام پر گفتگو کرتے یا رائے زنی فرماتے تو ان کے سامنے اسلامی اصول رہتے تھے۔ اسلامی احکام رہتے تھے، اسلامی قوانین رہتے تھے، اسلامی مفاد رہتے تھے۔ مسلمانوں کی فلاح و بہتری رہتی تھی چاہے وہ مجلس کانگریس ہو یا مسلم لیگ ہو یا کوئی اور جماعت ہو، ان کے سامنے پارٹی بازی کی گندگی کبھی نہیں رہتی تھی۔ وہ پارٹی بازی کے ماتحت کسی مسئلہ کو نہ سوچتے تھے اور نہ سوچنا چاہتے تھے، نہ پارٹی بازی کی اس ذہنیت کو وہ درست سمجھتے تھے بلکہ وہ پارٹی ہی کو اسلامی اصول و احکام کے ماتحت سوچتے تھے، جو اسلامی مفاد کے مطابق اسلامی مفاد کے ہم آہنگ ہوتی تھی۔ اس کی ہم آہنگی میں ان کو کبھی باک نہیں ہوتا تھا۔ اور جو مجلسیں اپنی پارٹی اصول پر ہو کر ہر طرح کی غلط اور صحیح چیزوں کو اختیار کرتی تھیں، تو مولانا مرحوم اپنے نقطۂ نظر کی بنا پر صاف لفظوں میں غلط کہہ دیتے تھے اور صحیح کو صحیح فرما دیتے۔

مولانا مرحوم کی عملی زندگی کا یہ وہ معیار ہے جس پر ان کی زندگی کے تمام کارنامے مبنی ہیں، اور جو اصولاً اپنے اندر یکسانیت رکھتے ہیں، لیکن جن لوگوں کی نگاہ مولانا مرحوم کی عملی زندگی کے اس بنیادی اصول پر نہیں ہے ان کو تخالف اور تضاد نظر آئے گا۔

مولانا مرحوم کی زندگی اتنی خوبیوں کی مالک تھی کہ اُن کا ایک مختصر مضمون میں سمانا ممکن ہے نہ میرے ایسے پریشان عمل انسان کے لیے ان کا جمع کرنا ممکن ہے۔ مولانا مرحوم بہار کے قومی، جماعتی، تعلیمی، دینی گلزار کے بہار تھے۔ آہ کہ آج ایک مولانا مرحوم کے فقدان کے باعث سب پر اوس برس رہی ہے اور خزاں کی مردنی چھائی ہوئی ہے۔ اللہ مولانا مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے مشن کیلئے غیب سے تائید فرمائے۔ آمین۔

مولانا کی یاد میں

از:۔۔۔۔۔ مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم

راقم نے جب گھر میں آنکھیں کھولیں وہاں چار بزرگوں کے نام بڑے احترام ــــ سے لیے جاتے تھے، ان میں دو زندہ تھے اور دو ابدی نیند سو چکے تھے۔ میری والدہ مرحومہ اپنے والد ماجد مولانا عبدالصمد اوگانوی (متوفی ۱۳۱۸ھ) اور اپنے خالو مولانا وحید الحق استھانوی (م ۱۳۱۵ھ) کے نام بڑے احترام سے لیا کرتیں، ان کے کارنامے سُناتیں، ان کے دینی جوش اور قومی خدمات کا ذکر پُر خلوص سادگی اور سچے ولولے کے ساتھ کیا کرتیں۔ زندوں میں وہ اپنی ننہال پنہسہ ضلع پٹنہ کے دو بزرگوں کا تذکرہ بہت اخلاص سے کرتیں۔ بڑے بھائی جو صوفی و مجذوب تھے (اور اب تک ہیں) بڑے مولوی صاحب۔ اور چھوٹے بھائی جو اس وقت بھی (یعنی آج سے بیس پچیس برس پہلے) بڑے عالم کی حیثیت سے مشہور تھے، چھوٹے مولوی صاحب کے نام سے یاد کیے جاتے۔

اچھی طرح یاد نہیں کہ چھوٹے مولوی صاحب کی خدمت میں مجھے پہلی بار کب نیاز حاصل ہوا۔ تحریک خلافت کے ہنگامہ خیز دنوں میں راقم ایک انگریزی اسکول کا طالب علم تھا والد ماجد مقامی خلافت کمیٹی اور جمعیۃ علماء کے خاص کارکن تھے، اسکول چھوڑ کر مدرسہ آنا پڑا، والد ماجد کے ہاں آئے دن جمعیۃ علماء اور خلافت کمیٹی کی گشتی چٹھیاں آتی رہتی تھیں، خیال

آتا ہے کہ سب سے پہلے انھیں مراسلوں میں ابوالمحاسن محمد سجاد کان اللہ لہٗ نظر سے گذرا، ان ہی دنوں ایک روداد انجمن علمائے صوبہ بہار (۱۹۱۷ء) کہیں پڑی ہوئی ملی، بے سمجھے بوجھے پڑھ گیا۔ اس روداد سے اور کوئی فائدہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو پر اس وقت حافظہ پر زور دینے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ مولانا محمد سجاد مرحوم کا نام ذہن و دماغ پر پہلے پہل اسی روداد کے ذریعہ مرتسم ہوا۔

غالباً ۲۳ء کا ذکر ہے، بعض عزیزوں کے بلاوے پر پہلی مرتبہ پنہسہ جانا ہوا۔ وہاں خاندانی نشست گاہ میں ایک چوتھائی حصہ گھرا ہوا ملا۔ معلوم ہوا کہ یہ مولوی صاحب کی بیٹھک ہے اور لوگوں کے فسق و فجور سے آنکھیں بچانے کے لیے انھوں نے پردہ کی دیوار کھڑی کر دی ہے، اس کے بعد کئی سال تک مسلسل اور بار بار پنہسہ جانا ہوا۔ لیکن مولاناؒ ایک ہی دو مرتبہ دکھائی دیے اور شاید ایک آدھ بار میں نے سلام کرنے کی بھی ہمت کی، ایک بزرگ نے بلا کر مولاناؒ کے پاس بٹھایا بھی پر کوئی گفتگو یاد نہیں۔

مدرسہ کی تعلیم کے دو چار زینے طے ہو چکے تھے کہ مدرسے (مدرسہ عزیزیہ بہار شریف) ہی کے احاطہ میں اصلاح نصاب تعلیم کے متعلق علما کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ شوال کی ابتدائی تاریخیں تھیں۔ مدرسہ ۸ شوال کو کھلتا تھا، لیکن جلسہ کے شوق میں، میں وقت سے پہلے بہار آگیا اور تمام نشستوں میں حاضر رہا۔ اس وقت مجھے پہلی مرتبہ مولاناؒ کی عظمت کا احساس ہوا۔ بڑے بڑے علما کا مجمع تھا۔ مولانا عبدالوہاب صاحب مہتمم مدرسہ امدادیہ لہیریا سرائے دربھنگہ صدر نشیں تھے۔ بحث و تمحیص میں حصہ لینے والوں میں مولانا ابو نعیم محمد مبارک کریم (سپرنٹنڈنٹ اسلامک اسٹڈیز، بہار) اور مولانا حکیم شرف الحق صاحب بہاری خاص طور پر قابل ذکر ہیں، لیکن اجلاس کے روح رواں مولانا محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ ہی تھے۔ مولانا چاہتے تھے کہ صوبۂ بہار کے تمام عربی مدرسے ایک نظام کے ماتحت آجائیں اور ایک نصاب تعلیم پر ہر جگہ عمل درآمد ہو۔ اس تجویز کے ذریعہ

اصل میں وہ مدرسہ اکزامنیشن بورڈ کے نئے فتنے (جو اس وقت نیا تھا) کا سدباب کرنا چاہتے تھے، ان کی خواہش تھی کہ سرکاری امتحانات کے بدلے آزاد قومی امتحانات ہوں۔ تجویز یہ بھی تھی کہ مدرسہ عزیزیہ کو اس نئے قومی تعلیمی نظام کا مرکز قرار دیا جائے اور اپنی پائدار مالی حیثیت کی وجہ سے وہ اس کا اہل بھی تھا۔ اجلاس تو کامیاب رہا اور ہم ناسمجھ تو بڑی امیدیں لے کر اُٹھے تھے لیکن کچھ ہی دنوں بعد معلوم ہوا کہ خود ہمارا مدرسہ سرکاری اکزامنیشن بورڈ سے ملحق کر دیا گیا۔ جب حریفوں نے مجوزہ مرکز ہی کو توڑ لیا تو پھر کیا امید ہو سکتی تھی۔

اس اجلاس کا راقم کے دل و دماغ پر بُرا اثر رہا اور مولانا رح کی اس مفید تجویز کی ناکامی کا داغ آج تک دل سے محو نہ ہو سکا ——— اس کے بعد دن گذرتے چلے گئے، اخباروں میں مولانا رح کے کاموں کی روداد یں پڑھتا رہا۔ جریدۂ امارت کا خریدار بھی تھا۔ گھر پر بھی مولانا رح کا ذکر خیر رہتا، لیکن ایک عرصہ تک کوئی تفصیلی گفتگو یا ملاقات کی سعادت حاصل نہ ہو سکی۔

جولائی ۲۷ء یا اس کے لگ بھگ راقم دہلی جا رہا تھا، کسی عربی مدرسہ میں تکمیل تعلیم کا قصد تھا۔ والد ماجد نے مولانا رح کو خط لکھا، مولانا رح دورے میں تھے، کچھ تعویق سے ان کا گرامی نامہ ملا اور اس میں ایک طویل مکتوب مفتی محمد کفایت اللہ صاحب کے نام تھا جس میں راجپال ایجی ٹیشن اور وقت کے دوسرے مسئلوں پر اظہار رائے کے علاوہ راقم کے لیے سفارش کی گئی تھی یہ پہلا موقع تھا کہ مولانا رح کو اس خادم کی ذات سے دلچسپی پیدا ہوئی جو روز بروز بڑھتی گئی اور آخر وقت تک قائم رہی، لیکن تفصیلی گفتگو اور بلاواسطہ نیازمندی اب بھی حاصل نہیں تھی۔

دلّی کا ماحول راس نہ آیا تو میں ندوہ چلا آیا۔ سنہ اچھی طرح یاد نہیں، غالباً میں تکمیل ادب میں تھا، سنہ ۲۹ء یا سنہ ۳۰ء ہو۔ چھٹیوں میں وطن آ رہا تھا، بختیار پور میں مولانا رح

پر نظر پڑی مشتاقانہ اُن کی طرف بڑھا، وہ بھی تیسرے ہی درجہ میں سوار ہوئے اور بہار شریف تک کامل دو گھنٹے شرف صحبت حاصل رہا، یہ پہلا موقع تھا کہ مولانا رح سے کسی علمی و ملّی مسئلہ پر کھل کر گفتگو کا موقع ملا، عاجز نے خوب خوب سوال کیے اور وہ میری تسکین و تشفی کے ساتھ معلومات میں اضافہ فرماتے رہے۔ دہلی جاکر میں نے مولویوں اور ان کے علم کے بارے میں جو رائے قائم کی تھی اس میں کچھ ترمیم کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ وہ بار بار یہی فرماتے رہے، اب تمام توقعات تم ہی لوگوں سے وابستہ ہیں، آؤ اور یہاں رہ کر کچھ کام کرو۔

غالباً گرمیوں کا موسم تھا اور "نمک" کی تحریک چل رہی تھی، چھٹیوں میں راقم بھی وطن آیا ہوا تھا۔ مولانا رح ایک وفد کے ساتھ بہار شریف تشریف لائے۔ مولوی منظر علی ندوی (مرحوم) اور پروفیسر عبد الباری بھی ساتھ تھے، جامع مسجد میں جلسہ ہوا۔ مولانا رح نے دو گھنٹے تقریر کی سارا مجمع پتھر کی مورت بنا ہوا تھا، میں نے اپنی زندگی میں خطابت اور اس کی تاثیر کا بالکل نیا نمونہ دیکھا۔ زبان میں لکنت، بیان میں سادگی، نہ ابو الکلام کی خطابت، نہ بخاری کے چٹخارے، نہ احمد سعید کی زبان۔ مگر مجمع ہے کہ دم بخود ہے اور ہاں ہاں کر رہا ہے، اور مجمع بھی کیسا؟ تحریک کے مخالفوں کا۔ میں بار بار مولانا رح کی طرف حیرت سے دیکھتا تھا اور دل میں ان کی عظمت بیٹھتی جاتی تھی۔ اس تقریر سے میری معلومات میں بڑا اضافہ ہوا، اور لاتلقوا بایدیکم الی التھلکۃ کے شانِ نزول سے پہلی مرتبہ کان آشنا ہوئے۔

سنہ ۳۲ء کے آغاز میں راقم نے "الضیاء" (عربی ماہنامہ) نکالنا شروع کیا، تو مولانا رح نے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا، رسالہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتا اور وہ ایک نظر اس پر ضرور ڈال لیتے، لکھنؤ تشریف لاتے تو خادم کو ضرور پوچھتے۔ مسلم یونیٹی بورڈ کے جلسے غالباً سنہ ۳۲ء کے اواخر میں ہوئے اور اس سلسلہ میں مولانا رح کا لکھنؤ میں ہفتوں قیام رہا، اس دوران میں

راقم برابر حاضر ہوتا اور ان کے افادات سے اپنی کم مائگی دور کرنے کی کوشش کرتا، مولانارح ہی کی نوازش سے راقم یونیٹی بورڈ کے مجلس مضامین میں برابر شریک ہوسکا اور حقیقت میں یہی یونیٹی بورڈ کے جلسے تھے جہاں مولانارح کے سیاسی تدبر کا لوہا موافق و مخالف سب ماننے پر مجبور ہوتے، یوں کہنے کو تو جمعیۃ کی پوری مجلس انتظامی موجود تھی، بورڈ میں اس کے نمائندے بھی موجود تھے، پر دماغ ایک تھا اور سب جسم محض کی حیثیت رکھتے تھے۔ مولانارح لکھواتے، نوٹ کراتے، بتاتے، اور ایک انگریزی داں، بورڈ کے سامنے ان کی ترجمانی کرتا، اور ساری مجلس عاملہ حاضرین کا منہ دیکھا کرتی۔ یونیٹی بورڈ کے مشورے لکھنؤ میں دوسری مرتبہ مسلسل تین روز تک ہوتے رہے۔ سارا اسلامی ہند کا عطر کھینچ کر آگیا تھا۔ قابل ذکر شخصیتوں میں صرف علامہ اقبال مرحوم نہیں تھے، خالص قانونی موشگافیوں سے لے کر ٹھیٹھ فقہی مسئلے بھی بساط بحث پر آجاتے، پورے مجمع میں دو شخصیتیں سب پر بھاری تھیں، ایک ظاہری طور پر باوقار اور وجیہ صدر کی بغل میں کرسی نشین ہوتا اور دائیں بائیں اس کے دو وزیر (ڈاکٹر سید محمود اور مسٹر آصف علی) اپنی جگہ لیتے۔ میرا اشارہ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد مدظلہٗ کی طرف ہے اور دوسرا ظاہری طور پر خستہ حال ایک کنارے معمولی لباس میں، کاغذوں کا ایک بستہ لیے ہوئے لکھنے لکھانے میں منہمک ہوتا میری مراد مولانا مرحوم سے ہے۔ مولانا ابوالکلام صرف ہدایات دیتے ——————— آصف علی صاحب مسودے تیار کرتے اور مولانارح سب کچھ خود ہی کرتے، البتہ زبان کی لکنت کے باعث اپنا ترجمان ہلال صاحب زبیری[1] کو بناتے۔ مشوروں میں بسا اوقات قاضی سید احمد حسین صاحب بھی شریک ہوتے۔ بڑے بڑے شیریں مقال بیرسٹر اور لیڈران دونوں بزرگوں

---

[1] ہلال احمد صاحب زبیری سابق مدیر "الجمعیۃ"۔

کی طرف دیکھتے، ان کی نکتہ آفرینیاں سنتے اور انگشت بدنداں رہ جاتے۔

سنہ ۳۴ء کی گرمیوں کا واقعہ ہے، لکھنؤ سے وطن آرہا تھا، درمیان میں دو چار گھنٹوں کے لیے پٹنہ اتر پڑا، حسب معمول اسٹیشن سے سیدھے بھائی مناظر علی ندوی مرحوم کے گھر کا رُخ کیا راستہ ہی میں منظر مرحوم بدحواس ملے۔ میں نے پوچھا خیریت؟ بولے پنہسہ جارہا ہوں۔ میں نے کہا "پنہسہ"؟ انھوں نے کہا ہاں، حاسو (حسن سجاد) کا انتقال ہوگیا۔ مولانارح کے ہاں تعزیت کو جارہا ہوں۔ خبر کیا تھی؟ ایک بجلی، سر پکڑ کر رہ گیا۔ میرا بچپن کا کھیلا ہوا دوست اور بھائی جس کی تقریب شادی رچائی جارہی تھی وہ آن کی آن میں رخصت ہوگیا!! مولانارح کو تار پر تار دئے گئے، لیکن قومی ضروریات پر اکلوتے نونہال کی قربانی انھوں نے خوشی خوشی گوارا کرلی پہنچے بھی تو اس وقت جب نوخیز وہونہار لڑکا اس دنیا سے دنی پر آخری حسرت بھری نگاہیں ڈال رہا تھا۔ بار بار یہی سوچتا تھا کہ مولانارح کا کیا حال ہوگا؟ ان کی تو دنیا ختم ہوگئی۔ دل میں آیا منظر صاحب کے ساتھ پنہسہ چلا چلوں لیکن ہمّت نہ بندھی ——— ہفتہ عشرہ کے بعد استاذی مولانا عبدالحلیم صدیقی تعزیت کو تشریف لائے، میں بھی بہار سے ساتھ ہولیا۔

مولانارح اپنی نشست گاہ میں تشریف رکھتے تھے۔ صدیقی صاحب لپک کر بغل گیر ہوئے، یہ خادم بھی اس سعادت میں شریک رہا۔ ہم لوگ (کم از کم راقم تو ضرور ہی) سراسیمہ تھے لیکن مولانارح صبر و وقار کا مجسمہ نظر آئے، چہرہ زرد، قدم لڑکھڑا رہے تھے پر زبان پر اُف نہیں۔ باتیں ہوتی رہیں، لیکن کیا مجال کہ مایوسی کی پرچھائیں بھی دکھائی پڑے۔ اللہ رے صبر! اور واہ رے ضبط!!

میں جب تک ندوہ میں رہا، نیازمندی اور استفادہ کا موقع بہت کم ملا، البتہ جب بھی وہ لکھنؤ تشریف لاتے خادم کو ضرور پوچھتے، کبھی کبھی خاص کر دارالعلوم تشریف لاتے،

بسا اوقات ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب (ناظم ندوۃ العلماء) اور علی میاں (مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی) کی زبانی اطلاع ملتی کہ "مولانا رح تمھیں پوچھتے تھے" ـــــــــ لیکن جب دسمبر ۱۹۲۷ء میں لکھنؤ چھوڑ کر پٹنہ آنا ہوا، تو پھر مولانا رح کو بہت قریب سے دیکھنے اور ان کی نجی مجلسوں میں بیٹھنے کا موقع ملا اور جوں جوں قربت بڑھتی گئی، محبت و عقیدت میں زیادتی ہوتی گئی، میں نہ کانگریس کا سرگرم حامی، نہ جمعیۃ علماء کی پالیسی کا کامل مؤید اور نہ امارت ہی سے کوئی ایسی خاص وابستگی تھی، پر مولانا رح میں جانے کیا بات تھی کہ دل ان کی طرف بے اختیار کھینچتا تھا۔ اب تک جن لوگوں سے ملا، دو چار مستثنیات کو چھوڑ کر تعلقات کی زیادتی سے بدگمانی ہی بڑھی۔ بڑے بڑے عالموں کی مجلسوں میں جا کر بیٹھا، بعضوں کے نام سن کر دور دراز کے سفر کیے، پر نزدیک جا کر معلوم ہوا کہ ہر چمکتی ہوئی چیز سونا نہیں ہوتی، لیکن مولانا رح کا حال اس سے بالکل جُدا تھا۔ ان سے پہلی نظر میں بُعد محسوس ہوتا تھا، دو چار ملاقاتوں میں جا کر ان کے ذہن و دماغ کی بلندی کا صحیح احساس ہو پاتا اور اگر کہیں انھوں نے آپ کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا پھر تو بے اختیار جی چاہتا کہ علماء اور زعماء کی ساری جماعت اس فردِ واحد پر نچھاور کر دی جائے۔ خوش نصیبی سے راقم بھی ان مخصوص نیاز مندوں میں تھا جن سے مولانا رح اپنے منصوبے بہت کم چھپاتے تھے، وہ بڑی سادگی سے بتایا کرتے کہ بساطِ سیاست پر تمام مہروں کو چھوڑ کر کس طرح پیدل شہ مات دی جاتی ہے؟ اور کب فرزیں دے کر کھیل شروع کیا جاتا ہے؟ میں یہ جانتا ہوں کہ اسی پٹنہ میں دو چار ایسے بزرگ بھی ہیں جن کے سامنے مولانا رح اپنے خاکے اور منصوبے کھول کر رکھ دیتے تھے، جنھیں راقم جیسے تازہ واردانِ بساط ہوائے دل سے بیان کرنا مناسب نہیں خیال کرتے، پھر بھی انھوں نے اس خادم سے مختلف صحبتوں میں جو کچھ اور جتنا کچھ بیان کیا ہے، کھول کر بیان کرنے کی کوشش کی جائے تو نہ سننے والے تاب لا سکیں گے اور نہ کہنے والا ہی اپنے دل و دماغ کا توازن برقرار رکھ سکے گا۔

راقم کو آج کی صحبت میں نہ مولاناؒ کے خدمات گنانا ہیں اور نہ ان کی سیاسی بصیرت اور علمی دقیقہ سنجی پر روشنی ڈالنا ہے کہ یہ چیزیں اس مجموعہ کے دوسرے مضمون میں آگئی ہیں، اس تحریر میں صرف ان دھندلے نقوش میں رنگ بھرنے کی کوشش کی گئی ہے جو مرحوم سے ملنے اور ان کی صحبتوں میں بیٹھنے کے بعد دل و دماغ پر مرتسم ہوگئے تھے۔ یہ نقوش بھی بہت ہیں اور ان میں باتیں کہنے اور سننے کی بھی بہت ہیں، پر ابھی، کہ داغ تازہ ہے، ضبط و تحریر کی بھی تاب نہیں، موقع ملا تو پھر کسی تقریب سے تفصیل کی کوشش کی جائے گی۔ سردست اسی قدر پر اکتفا کرتا ہوا رخصت ہوتا ہوں۔